دلچسپ نظمیں

علمِ مجلسی

۷

پروفیسر عزیز الرحمٰن دہلوی

هو العزیز

علمِ مجلسی

دلچسپ نظمیں

حصہ ہفتم

مُرتّبہ

عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم

ادارہ علمِ مجلسی، ۵ ستنام ہاؤس، گرانٹ روڈ۔ کراچی ۱

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ھو العزیز

علمِ مجلسی

[redacted] دلچسپ مضامین

حصہ ہفتم

مرتبہ

عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم

ادارہ علمِ مجلسی، ۵ ستنام ہاؤس، گرانٹ روڈ۔ کراچی ۱

پانچواں ایڈیشن ... ... دسمبر ۱۹۶۲

مطبوعہ ... ... مشہور آفسٹ پریس
کراچی

کتابت ... ... حفیظ

قیمت ... 6/- ... [redacted]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامین

علم مجلسی حصہ ہفتم

(مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی)

عرضِ مؤلّف

ہم سے سیکھیں جو طرزِ نالہ کشی
پھول مُنہ چوم لیں عنادل کے

اس موجودہ حصّہ کے شائع کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ نہ اب وہ پہلے سے ولولے رہے۔ نہ اتنی کوشش وتلاش کی ہمت باقی ہے۔ جن حضرات نے علم مجلسی کے ابتدائی حصوں کی قدر کرکے میری ہمت افزائی فرمائی ہے۔ ان کی مسلسل بے تابانہ فرمائشوں نے جن کا تہ دل سے میں شکریہ ادا کرتا ہوں تعمیل ارشاد کے لئے مجبور کر دیا۔ اور موجودہ حصہ تیار کرنا پڑا۔ ساتھ ہی یہ عرض ہے کہ ؎

نوا سنجی کو کیا کچھ بُلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف ناحق دی چمن پیرائے عالم نے

یوں تو بادی النظر میں نظمیں وغیرہ جمع کر کے چھپوا دینا بالکل آسان معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس کا اندازہ بہت کم اصحاب کو ہوگا۔ کہ بڑے سے بڑے انبار میں سے مطلب کی چیزیں تھوڑی ہی سی دستیاب ہوتی ہیں ؎

ہم نے اپنے آشیاں کے واسطے
جو چبھے دل میں۔ وہی تنکے لئے

یوں تو دورانِ تلاش میں ایک سے ایک زیادہ دلچسپ مضمون ملتا تھا۔

مگر ان سے بھی اچھے مضامین ملنے کی امید میں اُن کو چھوڑ کر مزید کوشش اور تلاش جاری رکھی گئی۔ اور بہترین دلچسپ مضامین اس کتاب میں جمع کیئے گئے ؎

ہم وہ نہیں کہ اس کو بھی رکھیں حساب میں
جس آہ کا کہ چرخ نہم تک گزر نہ ہو

مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اتنی محنت و کوشش رائیگاں نہ گئی اور اس حصہ کے لئے مضامین کی تلاش و جستجو میں وہ انمول موتی اور جواہر ریزے ہاتھ لگے ہیں جو زمانہ کی ناقدری کے سبب کتابوں کے بوسیدہ اوراق میں مدفون خزانے کی طرح گم ہوئے پڑے تھے۔ لیکن شور انگیزی میں موجودہ زمانے کی پیداوار سے زیادہ لطف دے رہے ہیں۔ جس سے کتاب کی دلچسپی میں چار چاند لگ گئے ہیں ؎

رنگیں سوا ہے اب کے گُلِ نوبہار سے
اگلا جو برگِ زرد کوئی اس چمن میں ہے

مؤلف کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان حصوں میں لاجواب اور چوٹی کے مضامین کا مجموعہ ہونے کے سبب اس کتاب کے کل حصوں کو قبولیت عامہ کا فخر حاصل ہوگیا۔ اور بڑے بڑے لائق قابل فخر اصحاب نے مؤلف کی اس ناچیز تالیف کا ملاحظہ کر کے مؤلف کی قدردانی اور ہمت افزائی فرمائی ہے۔ اور مزید حصوں کا مطالبہ فرما رہے ہیں ؎

بھولے سے بھی کرتا ہے جو صیاد ذکرِ گل
بُلبل قفس سے سنتی ہے گردن نکال کے

لیکن جن صاحبان کو اس کتاب کے پہلے حصے ملاحظہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر پورا لطف اٹھانا چاہیں تو **کل** حصوں

کو ملاحظہ فرمائیں کیونکہ مختلف حصوں میں مختلف پیرائے کے مضامین ہیں اور ان کا لطف بھی علیحدہ علیحدہ ہے ورنہ محض ایک حصے سے جملہ حصوں کی دلچسپی کا اندازہ ہونا محال ہے ؎

غم ہجر کا نوشتہ کوئی دیکھتا مسلسل
یہ نہیں کبھی یہاں سے کبھی سن لیا وہاں سے

جیسا کہ ہر ایک مکان کے لئے دروازہ رکھنا ضروری ہے۔ اس ہی طرح یہ دستور پڑ گیا ہے کہ ہر ایک کتاب کے لئے دیباچہ بھی ضرور ہو۔ اس ہی خیال سے تھوڑا بہت ان صفحوں میں عرض کر دیا گیا ہے۔ ورنہ علم مجلسی کے متعلق تقریر و تحریر میں خوبی پیدا کرنے کے لحاظ سے مجھ کو جو کچھ عرض کرنا تھا۔ وہ اول کے دو تین حصوں کے دیباچہ میں عرض کر چکا ہوں۔ اب مزید سمع خراشی اور کہی ہوئی باتوں کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی ؎

وہ بات کونسی ہے جواب ان سے میں کہوں
مضمون وہ کونسا ہے جو پہلے لکھا نہیں

ممکن ہے ان اوراق میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کو خود ستائی پر محمول کیا جائے اور کہا جائے کہ طریقہ تو اچھا نکالا ہے کہ آپ ہی تالیف کریں اور آپ ہی تعریف کے گیت گائیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

وہ اپنی ہر ادا کی آپ ہی تعریف کرتے ہیں
نگہ نے نیچا مارا۔ زباں سے آفریں نکلی

اِس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ اس کتاب کا اصل مقصد تقریر و تحریر میں خوبی پیدا کرنا ہے۔ جو کچھ بھی کہا جائے وہ ایسا ہو کہ سننے والے کے کانوں کو خوش گوار معلوم ہو اور اس کے دل میں بیٹھ جائے اور اپنی دلیل کے ثبوت

میں حسب موقع شعر سے اپنی تقریر وتحریر کو دلچسپ اور مدلل بنا دیا جائے۔ آگے یا قسمت یا نصیب۔ اس ہی خیال سے برائے نمونہ یہ چند صفحے "عرض مؤلف" کی صورت میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ ورنہ جیسا کہ پہلے کئی دفعہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خاکسار مؤلف نہ تو شاعر ہی ہے اور نہ انشا پرداز۔ ہاں کوئی کھٹکے دار مضمون سن کر یا پڑھ کر اپنی سمجھ اور لیاقت کے موافق اس کا تھوڑا بہت لطف اٹھانے کا شوق اس کو ضرور ہے ؎

نہ ہم گل ہیں نہ بلبل ہیں فقط رنگیں طبیعت ہیں
نہ ہم صحنِ چمن میں ہیں۔ نہ دیوارِ گلستاں پر

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ تقریر وتحریر میں اشعار جو استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کو نفس مضمون سے کوئی مناسبت یا تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے بے محل و بے موقع اشعار کو سن کر تقریر وتحریر کا اثر قبول کرنے کی بجائے سامعین کی توجہ ایسے اشعار کے بے جا استعمال میں لگ جاتی ہے اور تقریر وتحریر کا اصل منشا رغتر بود ہو جاتا ہے۔ ایسے بے تُکے اشعار استعمال کرنے سے مقرر یا محرر کی شعر فہمی کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے اور سامعین کے مُنہ سے اعتراضاً یہ شعر نکل جاتا ہے ؎

گویا ہے عین جامہ دری یہ رفوگری
جوڑے کہاں پہ جاتے ہیں پرزے کہاں کے ہیں

یہاں پر برجستہ اشعار کا ذکر کرتے ہوئے فارسی کے دو قطعے یاد آگئے۔ ایک باپ کی طرف سے بیٹے کو نصیحت کرنے میں ہے اور دوسرا قطعہ بیٹے کی طرف سے اس کے جواب میں ہے۔ جن کا پڑھنا مضمون کے لحاظ سے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

قصہ یوں ہے کہ ایک شخص سرد وگرم زمانہ چشیدہ تھا۔ اس نے دنیا کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہوئے تھے۔ زمانے کی سختیاں جھیل چکا تھا۔ ہر طرح کے افعال کا خمیازہ بھگت کر تائب ہو چکا تھا۔ خانگی تفکرات کی پریشانیوں میں پھنسا ہوا تھا کہ اس نے اپنے نوجوان صاحبزادے کی جوانی کی اُمنگوں اور محبت کی پینگوں کو تاڑ کر اُس کو ان مخمصوں میں اپنی جان کو پھنسانے سے باز رکھنے کے لئے نصیحت کی اور اپنی حالتِ زار کا خاکہ اِن لفظوں میں کھینچکر اس کو دکھایا کہ ؎

جانِ پدر تو سفرۂ بے ناں ندیدۂ　　جنگِ عیال وگریۂ طفلاں نہ دیدۂ
ننشستۂ بہ گوشہ ازبیم قرض خواہ　　در مفلسی تو آمدِ مہماں نہ دیدۂ

ہونہار صاحبزادے جو اس وقت جوانی دیوانی کے نشہ میں سرشار تھے دنیا و مافیہا سے بے پرواہ تھے۔ جن کو ہرا ہی ہرا دکھائی دے رہا تھا۔ عشق کا بھوت ان کے سر پر چڑھا ہوا تھا۔ کسی کی صورت آنکھوں میں سما رہی تھی اور دل میں اُمنگوں کا ہجوم تھا۔ بھلا ایسی مصیبت اور پریشانی کی باتوں کو کب خیال میں لانے والے تھے۔ بلکہ دنیا کی تمام نعمتوں کو خیالِ یار پر تصدق کرنے کو تیار تھے انہوں نے جو کچھ جواب دیا وہ یہ ہے کہ ؎

بابا مگر تو جلوۂ جاناں نہ دیدۂ　　چشم سیاہ و زلفِ پریشاں نہ دیدۂ
ننشستۂ بہ گوشہ در انتظارِ یار　　ناگاہ زِ در در آمدِ جاناں ندیدۂ

اس کے اخلاقی پہلو سے قطع نظر کر کے کہ ایسا جواب ایک شریف بیٹے کے لئے اپنے باپ کو دینا زیبا تھا یا نہیں مذکورہ بالا قطعہ علمی نکتۂ خیال سے دیا گیا ہے۔ ملاحظہ طلب بات یہ ہے کہ چاروں مصرعوں کی چاروں باتوں کا جواب اپنے خیال کے مطابق فرداً فرداً بالترتیب کس عمدگی سے دیا ہے۔ کہ باپ بھی

یہ جواب سن کر شش در رہ گیا۔ اُس کے لئے یہ مشکل آپڑی کہ صاجزادے صاحب کے ایسے رندانہ جواب پر اظہار ناراضگی کرے یا ایسے لائق و فائق بیٹے کے اس علمی قابلیت کے جواب کی داد دے کر اس کو گلے سے لگالے۔ اِدھر بیٹے نے باپ کی یہ گومگو حالت دیکھ کر اور اپنی فتح محسوس کر کے اپنے دل میں یہ شعر فخریہ پڑھا:-

پھول جب جھڑنے لگے رنگیں بیانی سے مری
رہ گئی حیرت سے بُلبل کھول کر منقار کو

موجودہ حصے میں بہت سی تجربے کی باتیں اور عبرت انگیز و نصیحت آمیز مضامین دیئے گئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان کو پڑھنے سے کبھی نہ کبھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ دل پر نہ کھچ جائے۔ اور ان سے عبرت و نصیحت حاصل نہ ہو۔
اس لئے ناظرین سے التماس ہے کہ بعض اُن مضامین کو چھوڑ کر جو محض تفریحاً دیئے گئے ہیں اس کتاب میں سبق آموز اور نصیحت آمیز مضامین کو بار بار پڑھیں۔ جو کہ شاعرانِ باکمال نے بڑے بڑے تلخ تجربوں کے بعد جوانان سعادت مند کے فائدہ کے لئے لکھے ہیں ؎

کام آئے گی۔ فغانِ عنادل کو گوش کر
اچھی ہے بات کان میں لے گل پڑی رہے

اکتوبر ۱۹۳۱ء
مطابق
جمادی الثانی ۱۳۵۱ھ

دعاگو اور دعائے خیر کا طالب
ناچیز۔ عزیز الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمدِ باری تعالےٰ

(از حضرت بیدل)

قلم سے ہوئی جس کے سب آشکار　　جہاں کے نگارش کدہ کی بہار
اُسی سے عیاں نقش سارے ہوئے　　جو چھڑکا قلم تو ستارے ہوئے
یہ سورج دیا جو خدائی کا ہے　　یہ دھبّا سا اک روشنائی کا ہے
یہ جاذب کا کاغذ ہے یا آسماں　　یہ مشقِ شکستہ ہے یا کہکشاں
یہ قوسِ قزح جو نمودار ہے　　یہ آدھا سا اک خطِ پرکار ہے
نہ کیوں اس کے کاموں میں ہو عقل دنگ　　ہیں اِک خط کے اندر بھری ہفت رنگ
درخشاں نہیں چرخ پر ماہتاب　　کھلی سورۂ نور کی ہے کتاب
شعاعیں ہیں مسطر لگائے ہوئے　　طلا کار جدول بنائے ہوئے
کریں تا کہ قدرت کو اُس کی رقم　　ہیں پتّے ورق اور شاخیں قلم
نظر کیجئے سطحِ تالاب پر　　لکھی نظم ہے صفحۂ آب پر
جو جاری کوئی باغ میں نہر ہے　　تو اک شعر گویا ہر اِک لہر ہے
سنو شورِ قمری فصاحت ہے یہ　　قدِ سرو دیکھو بلاغت ہے یہ
جو نور اُس نے چشمِ بشر میں دیا　　بتِ خاک کو چرخ پیما کیا
عجب اس کی ہر شے بنائی ہوئی　　ہے تل میں خدائی سمائی ہوئی

ترے منہ میں باقی ہے جب تک زباں
کر اے دِل تو تحمیدِ خلّاقِ جاں

مناجات

فضل کر اس بندۂ عاجز پہ اے میرے خدا ... تو سزا وارِ کرم ہے میں ہوں بے شک ناسزا
میں بلاؤں میں گھرا ہوں میں مصائب میں پھنسا ... دور کر دے ہر مصیبت ہر بلا سے تو بچا
کر دیا بیماریوں نے میری صحت کو خراب ... میں مریضِ ناتواں ہوں ہاتھ میں تیرے شفا
میں ہوں عاصی میں ہوں خاطی تو ہے غفار الذنوب ... میں گرفتارِ بلا ہوں تو میرا مشکل کشا !
میں ہوں ادنےٰ تو ہے اعلےٰ تو غنی میں ہوں فقیر ... تو شہنشاہِ دوعالم میں ترا ادنےٰ گدا
میں ہوں دست و پا شکستہ تو ہے میرا دستگیر ... میں ہوں گمراہی میں اے مولا میرا تو رہنما
مہربانی مجھ پہ فرما اور کر الطاف تو ! ... تو خفا مجھ سے نہ ہو گو خلق ہے مجھ پر خفا
اِس شبِ تاریک غم کو دور کر سر سے مرے ... اے مرے رب مجھ پہ خوش وقتی کا جلدی دن چڑھا
اے مرے داتا مرے ناصر مجھے منصور کر ! ... کر دے تو حاجت روائی اے مرے حاجت روا
صبر کی جا صبر دے اور شکر کے موقع پر شکر ... دور کر عصیاں سے مجھکو اپنی جانب تو جھکا
دے محبت اپنی اور دنیا سے نفرت دے مجھے ... دور کر حرص و ہوا اپنا مجھے شیدا بنا

یاد ہو لب پہ تری اور دل پہ ہو تیرا خیال
ہو عیاں پاکیزگی اور دل میں ہووے اتقا

شمع رو جلوہ کناں تھا مجھے معلوم نہ تھا ... صاف پردے سے عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گل میں بلبل میں ہر اک شاخ میں ہر پتے میں ... جابجا اس کا نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
یہ غلط ہستیٔ موہوم کو سمجھے تھے مگر ... اور وطن اپنا جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ایک مدت حرم و دیر میں ڈھونڈا ناحق ... سیمبر دل میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سچ تو یہ ہے کہ سوا یار کے جو کچھ تھا حیات
وہم تھا شک تھا گماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

زمزمۂ نشاط (جناب اعجاز)

زندگی مزے کی ہے لطفِ جاں اٹھائے جا
لطفِ جاں اٹھائے جا یہ مزے اڑائے جا

حملہ ہائے فکر و غم ہوں اگرچہ دم بدم
وار سب بچائے جا فکر و غم ٹلائے جا

ظلمِ دشمناں سہی۔ جورِ دوستاں سہی
اشک رازداں سہی۔ بھول جا بھلائے جا

داغ رفتگاں سہی۔ سوزشِ نہاں سہی
داغ یہ چھپائے جا۔ آگ یہ بجھائے جا

ماجرائے حسن و عشق خارِ دل اگر بنے
دل سے تو نکال پھینک یہ خلش مٹائے جا

زندگی کہیں جسے یہ تو سیلِ آب ہے
بہ چل اور بہائے جا بہ چل اور بہائے جا

شب زیادہ شمع کم ہے اگر تو کیا ہے غم
جب تلک کہ جل سکے بے دھڑک جلائے جا

مغتنم ہے ساقیا فرصت انبساط کی
پی بھی اور پلائے جا، پی بھی اور پلائے جا

ما مضیٰ پہ خاک ڈال کل پہ چھوڑ کل کا حال
جام و شیشہ اب سنبھال دورِ مے چلائے جا

جو ہوا وہ ہو چکا عاقبت کی فکر کیا
آج ہے بڑا مزہ یہ مزا اڑائے جا

میری جان عندلیب بامِ شاخسار سے
تختِ نو بہار سے فرطِ انبساط سے

مستیٔ نشاط سے خوب چہچہاتے جا!
خوب چہچہائے جا، فصلِ گل منائے جا

فصلِ گل منائے جا، راگنی سنائے جا
راگنی سنائے جا، دل میرا لبھائے جا

محوِ نغمۂ طرب تو مجھے بنائے جا

تیری زندگی ہے راگ میری زندگی ہو رنگ
راگ رنگ مل گئے میں سنوں تو گائے جا

گائے جا بجائے جا خوب چہچہاتے جا
مستِ نغمۂ نشاط تو مجھے بنائے جا

اے خیالِ ابتدا اے خیالِ انتہا اے خیالِ احتیاط
اے خیالِ احتیاج اے معصیت اے خیالِ معدلت

اے ہوائے آرزو، اے امید و بیم تو!
دو گھڑی تو چین لے اتنا مت ستائے جا

اتنا مت ستائے جا، ہوش مت اڑائے جا
گل کھلا چمن دکھائے جا سبزہ لہلہائے جا

میری پیاری عندلیب تو بھی چھپائے جا

ہائے وہ تو اڑ گئی، توبہ یہ کیا سنا گئی　　جستجوئے عیش میں عمر مت گنوائے جا

بے طلب تو ہاتھ آئے اور طلب سے بھاگ جائے　　اشتیاق انبساط دل سے تو بھلائے جا

خدمتِ خدا و خلق ہے نشاطِ زندگی

اس میں اپنا جان و مال شوق سے لگائے جا

نوائے رنداں

تمام دردوں سے چھٹ گئے ہم بھلا ہو اُس دردِ بیدلی کا　　کھُلا ہے عقدہ یہ مدتوں میں ہمارے دل کی بلاکشی کا

لگاؤ ہر یا کہ لاگ ہو کچھ مزا ہے دونوں کی شورشوں میں　　غرض کہ دل میں ہو درد پیدا یہ ایک منصب ہے آدمی کا

جنابِ زاہد سے کوئی کہدے کہ یاد رکھیئے یہ پیر و مرشد　　رما و من میں کسی کی دھونی کہ گُر ہے یہ ہی خدارسی کا

نہ برق بجر کوئی چمکتا نہ طور جلتا نہ بھید کھلتا!　　کھلی ہیں آنکھیں سنا ہے جب سے فسانہ موسیٰ کی بیخودی کا

رولائیں مجھکو نہ دوست میرے بیانِ مرگِ عدو سنا کر　　کہ دشمنوں ہی کی دشمنی سے مزا اٹھا کچھ یا نہ دوستی کا

اُدھر سے آؤ اِدھر سے چلدو نہ ساتھ لاؤ نہ لے کے جاؤ　　سمجھ میں آتا نہیں ہے آساں عجب معمہ ہے زندگی کا

صدائے پیرِ مغاں عجب تھی عرب سے اٹھی جہاں میں گونجی　　جو ڈھونڈتے تھے مے مصفا عجیب عالم تھا ان کے جی کا

شرابِ توحیدِ حق نے عاقل بنا دیا دم میں عاقلوں کا　　اسی نے ٹھنڈا کیا کلیجہ تپش پرستان پارسی کا

نہ بادہ خواروں کو چھیڑ واعظ کہ ان کو پرواہ نہیں کسی کی　　وہ خوش ہیں پیرِ مغاں سے اپنے سکھایا گُر جس نے راستی کا

کبھی مذمت ہے دختِ رز کی کبھی ثنا گو ہیں میکدہ کے　　عجب طریقہ ہے شیخ صاحب سے میگساروں کی دل لگی کا

خمِ مغاں میں مئے معارف اسی طرح سے جھلک رہی ہے　　مگر یہ کھلتی نہیں کہ کیونکر دماغ بگڑا ہے مولوی کا!

خلوص کی ہے بڑی ضرورت جو اس سے غافل ہیں ان سے کہدو　　کھلیگا آخر کو بھید اک دن دلوں کے شوق نمائشی کا

حمید تعلیم و بندگی کو بناؤ ہر دم شعار اپنا

زبان پہ لانا نہ بھول کر بھی گلہ کبھی ان کی بے رخی کا

ایک ناکام بیرسٹر (مولانا ظفر علی خاں)

لٹائی خوب ہی باوا کی دولت ہم نے لندن میں — گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں

خریدار متاعِ جلوہ تھا یاں حسنِ بے پردا — بھرے تھے پھول رنگا رنگ آزادی کے دامن میں

نہ تھی مضمر نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی — نہ تھے ناز و ادا پنہاں یہاں پردے کی چلمن میں

نظر آیا یہاں پریوں کا ہم کو جمگھٹا ایسا — لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں

کبھی جھانکا کیے گرجے میں جا کر ماہ رویوں کو — کبھی تاک آئے ہم جا کر کسی گلرو کو گلشن میں

کبھی پہنچے جو تھیٹر میں تو چھنوا آئے دل ان سے — ہے جادو جن کی باتوں میں ہے شوخی جن کی چتون میں

کبھی پکنک کے جلسہ میں ہوئے شامل تو دن دن بھر — حمائل ہاتھ تھے شمپین کی بوتل کی گردن میں

ہمیں گلیوں میں شبکو بار ہا یہ مرغِ دل اپنا — نظر آیا کسی گیسوئے زریں کے نشیمن میں

کبھی گھوڑ دوڑ میں جا کر لگائیں بازیاں ہم نے — کہ اس میں جیتنا اور ہارنا داخل ہے فیشن میں

مٹن چاپ و کٹلٹ کھا کے خوب ہنستے تھے ہم اُن پر — مگن رہتے ہیں جو دال و چپاتی اور سالن میں

پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت — بسر ہوتی ہے کیونکر پاجامہ اور اچکن میں

بڑے اینڈتے ویسٹ انڈ میں جب جا نکلتے تھے — تو خم آنے نہ دیتا تھا کلف کالر کا گردن میں

ہماری ٹائی پن کے آگے سورج کی کرن یوں تھی — بڑا میلا سا اک تاگا ہو گویا چشمِ سوزن میں

خط آتا تھا جو باوا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا — تو لکھ دیتے تھے ہم محنت سے خوں بھی خشک کرتے ہیں

نہیں شک اس میں گو سیکھے ہزاروں ہم نے فیشن کے — نہ سیکھا ایک بھی نقطہ مگر قانون کے فن میں

کتابیں بن گئیں گلدستۂ طاقِ فراموشی — ہوئے رہ رہ کے برسوں فیل ہم ایگزامنیشن میں

ولایت میں غرض ہم نے اڑائے ایسے گلچھرّے — کہ لی جمشید نے حسرت سے کروٹ اپنے مدفن میں

مگر کب تک یہ گلچھرّے جو ہوتا گنجِ قارون بھی — تو ایندھن کے لیے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں

اٹھے جب صبح کو اک دن تو جیبوں میں نہ کچھ پایا — ہوئی خالی بھری تھی جسقدر اسٹیم انجن میں

شراب و مطرب و ساقی چھٹے یکلخت سب ہم سے — سکھایا بے زری نے فلسفہ آخر کو لندن میں

ہوتے جب ہمنشیں پرسانِ حال ان سے کہا میں نے

میں دامن ہی نہیں رکھتا جو الجھے خار دامن میں

مسلمان صاحبزادے

عمر کا سال ہوا خیر سے جب شانزدہم — رفتہ رفتہ ہوا اسکول کا جانا کچھ کم

کتبِ درسیہ بنتی چلیں دیمک کی غذا — دل کو بھانے لگا ناول وہی افسانۂ غم

ہسٹری دیکھنا معلوم ہوا کارِ فضول — طبعِ نازک کو کیا جاگرفی نے برہم

نقشے ملکوں کے ٹنگے گھر کی دیواروں پر — کھولنے کو جنہیں اک عرصے سے کھائی ہے قسم

میز لکھنے کی جو تھی اس پہ یہ آرائش ہے — ایک ٹوٹی سی دوات ایک پرانا سا قلم

شکل اُستاد سے ہوتی چلی نفرت دِل کو — بدمعاشوں کو بصد شوق بنایا ہمدم

کھیل اسکول کے اک آنکھ نہیں بھاتے اب — شغل ہے گنجفہ و شطرنج کا جاری ہر دم

ناموافق ہوئی آبادی سے باہر کی ہوا — چاندنی چوک کی گلگشت کا آیا موسم

شام کے واک کو پھر ٹھنڈی سڑک کے بدلے — چلے باجمع احباب سوئے کوئے صنم

خط جو آیا کبھی والد کا تو نوکر سے کہا — ابھی رکھو اسے فرصت نہیں پھر دیکھیں گے ہم

صحبتِ ماہ جبیناں میں کہاں صوم و صلوٰۃ — اب نہ دنیا کی رہی شرم نہ عقبےٰ کا غم

چار ہی روز میں پھر بنتِ عنب مُنہ کو لگی — پورٹ وائن کو سمجھنے لگے آبِ زمزم

اسی عرصہ میں کہیں آگئے والدان کے ! — پاس بٹھلا کے کہا لڑکے سے اے لختِ دلم

منہ ذرا سا نکل آیا ہے تمہارا کیسا ! — اتنی محنت نہ کرو پڑھنے پہ نورِ نظرم

خیر اچھا یہ بتاؤ کہ پڑھا کیا تم نے — ہو ترقی سے تمہاری دلِ محزوں خرم

پہلے کچھ دیر تو شرماتے رہے پھر بولے — اباجاں آپ نہ پوچھیں یہی از راہِ کرم

پڑھ چکا میں بھی مسلمانوں کے بچوں کی طرح
جاؤ کا ترجمہ گو، آؤ کی انگریزی ہے کم
اس سے زائد کی ضرورت بھی نہیں ہے فی الحال
ایک مسلمان کے بچے کو یہی ہے کیا کم!
سچ تو یہ ہے کہ بس اب وردِ زباں ہیں دو شعر
حضرت خواجہ حافظ نے کئے ہیں جو رقم
فاش می گویم واز گفتہ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم
نیست بر لوحِ دلم جز الفِ قامتِ یار
چہ کنم حرفِ دِگر یاد نہ داد اُستادم

بیٹا - (اکبر الہ آبادی)

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے
گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کا غرور ہے
خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں!
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
اکبر بھی اِس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی قول ہے یہ کہ ایسا ضرور ہے
البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہو ہونہار
مائل ہے نیکیوں پہ برائی سے دور ہے
سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پند کو
وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زور ہے
افکارِ والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے معین ہے اہلِ شعور ہے
راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے
رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست صحبتِ بد سے نفور ہے
کسبِ کمال کی ہے شب و روز اس کو دھن
علم و ہنر کے شوق کا دل میں وفور ہے
لیکن جوان صفات کا مطلق نہیں پتا
ہو پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

آسودۂ مرقد کا خطاب

نوجوان سے

کس کی آہٹ ہے سرِ بالینِ گورِ بےکساں — کون آیا ہے پئے نظارۂ عبرت یہاں
اے کہ تو پروردۂ خوش وقتیٔ ایام ہے! — جا کہ دنیا میں ابھی تو نوجوانِ خام ہے
گرم و سردِ دہر سے ہے تیرا دل ناآشنا — منہ لگا دور دِ زِ ساغرِ عیش کا تو کیا ہوا
جا کہ تیرے منتظر گھر میں ہیں سب جہانِ عیش — تودۂ گورِ غریباں پر کہاں سامانِ عیش

حاکم شہر سے

اے کہ دو روزہ حکومت تجھکو دنیا میں ملی — گوشہ دستار سے تیرے ہے پیدا سروری
ہے زباں میں تری پنہاں معنیِ حکمِ قضا — اے کہ جو تو نے کہا منہ سے وہ پورا ہو گیا
کیا کرے گا آ کے تو اس تربتِ بیجان پر — پہلے زندوں کی تو راحت کے لیے سامان کر

ایڈیٹر اخبار سے

اے کہ تیرے ہاتھ میں تحریر کا طومار ہے — صاحبِ تصنیف ہے یا ایڈیٹر اخبار ہے
داستاں لکھنی ہو تو زندوں کی لکھ جا کر کہیں — شہرِ خاموشاں سے تجھکو کچھ خبر ملتی نہیں

تیغ زن سے

اے کہ جوہر مردمی کی ہے تری شمشیر تیز — سلطنت کے واسطے رہتا ہے سرگرمِ ستیز
مردمی سمجھا ہے تو ایک قبضۂ تلوار میں — جوہرِ عزت طلب کرتا ہے اس کی دھار میں
دستگیری کر کسی بیکس کی یا محتاج کی! — ہے فضیلت راج سے بڑھکر دلوں کے راج کی
خفتگانِ خاک کو لینے ذرا آرام دے — چاہیے یاں آرام تو جیتوں کو جا آرام دے

شاعر سے

گو کہ اب شامل نہیں دنیا کی جاں والوں میں — اہلِ دل تجھکو سمجھتا ہوں جہاں والوں میں
آ کہ تو شاعر ہے تیری خاک گردوں پایہ ہو — سایہ بالِ ہما سے بڑھ کے تیرا سایہ ہے

نظم قومی

(اکبر الہ آبادی)

مسلمانوں بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تسلی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے
تمہیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آنکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر

کوئی آگے نہ تھا تم سے ترقی کی تگ و دو میں
کوئی دس میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں
تمہیں نے فرق بتلایا تھا سب کو گندم و جو میں
تمہیں سے سیکھ کر بنتی تھیں عالم مغربی قومیں
شرف پایا تھا تم نے امتیازِ حق و باطل سے
مخالف بھی تمہارے قدر دانی کرتے تھے دل سے

تمہاری عزتیں تھیں اوج تھا رتبہ تھا شانیں تھیں
تمہاری بات تھی احکام تھے کہنا تھا آئیں تھیں
تمہارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمہیں تم تھے زمانہ میں تمہاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو

تمہارا اتفاقِ باہمی دیوارِ آہن تھا
مخالف ایک کا جو تھا وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمہاری ہمتوں کا عرشِ اعظم پر نشیمن تھا
تمہارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم ہر فن تھا
تم اپنی حق پرستی سے دبا لیتے تھے دنیا کو
خدا کے سامنے جھک کر جھکا لیتے تھے دنیا کو

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ یہ ناحق پرستی تھی
طبیعت پہ نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی نہ ہمت میں یہ پستی تھی
نظر میں مظہرِ نورِ حقیقت ساری ہستی تھی
تمہاری وضع دلکش تھی تمہاری شان عالی تھی
خوش اخلاقی تمہاری مظہرِ شانِ جمالی تھی!

نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی | نہ وہ حسنِ عمل باقی نہ اب وہ حسنِ ظن باقی
نہ وہ ذوقِ ہنرمندی نہ شوق علم وفن باقی | نہ دل میں ہے وہ جوش حب یارانِ وطن باقی

جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی!
توقع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی؟

غضب ہے حبِّ اسلامی سے خالی سب کا سینہ ہے | حسد ہے ناتواں بینی ہے جھری ہے کینہ ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر ایک کا جینا ہے | یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینہ ہے

کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت
جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک مرض الفت

میں کیا تم سے کہوں اس وقت جو دل پر گزرتی ہے | تصور دل میں آتا ہے تو آنکھ اشکوں سے بھرتی ہے
طبیعت بات کرنے کو بھی مشکل سے ٹھہرتی ہے | خلش سینے میں ایسی ہے کہ وہ بے چین کرتی ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو | اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو | خواص خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ!
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

سخن معقول و موزوں ہو تو سب کا دل پھسلتا ہے | کلامِ خوش کلاماں رنگ بامعنی بدلتا ہے
زباں سے نعرۂ مدح و ثنا ہر دم نکلتا ہے! | مگر شوق عمل ہو واقعی تب کام چلتا ہے

توجہ گر نہ دل سے ہو تو پھر تاثیر کیوں کر ہو
کلامِ اکبر دلکش ہو یا مہدی کا لکچر ہو!

خوابِ خرگوش سے اٹھو

اٹھو پستی سے سونے والو ! ہے وقت کہ قوم کو سنبھالو
پہونچے منزل پہ قافلے سب دن ڈھل گیا کچھ تو دیکھو بھالو
اے دوست ہے یہ دم غنیمت کچھ توشۂ آخرت بنالو
دو پاٹ ہیں چل رہے شب و روز دانا ہو تو آپ کو بچالو !
جائے گی برات کوئی دم میں دولہا کو خواب سے جگالو
کرنی ہے تو کچھ بھلائی کر لو گر لو تو غریب کی دعا لو
فانی ہے یہ مال وجاہ دنیا! باقی ہے جو اس سے لو لگالو
چھوڑو یہ خمار و خواب مستی سمجھو کہ یہ ہیں حجاب ہستی

دلِ بیقرار سوجا

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سوجا کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سوجا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سوجا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کردے ! مرے پردہ دار سوجا مرے رازدار سوجا
مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا ترے غم میں آہ کب سے ہوں اشکبار سوجا
ابھی دہان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل کہیں مر مٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سوجا
نہ تڑپ زمین پہ ظالم تجھے گود میں اٹھاؤں تجھے سینے سے لگالوں تجھے کرلوں پیار سوجا
تجھے جن کا ہے تصور اے مستِ جامِ الفت انہیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے۔ شب غم بری بلا ہے
یہ تپش کا آہ شیوہ۔ نکر اختیار سوجا

شبِ غم

دلِ بدنصیب دیکھا وہ وقت آگیا ہے ! — تری تیرہ روزگاری نے اثر دکھا دیا ہے
وہی غمکدہ ہے تیرا وہی شام غم فزا ہے — وہی تو ہے اور تیری وہی غم بھری صدا ہے

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

وہی شام دھندلی دھندلی وہی رات کالی کالی — وہی خاموشی ہوائیں وہی بدلیوں کی جالی
وہی شمع پھیکی پھیکی مرے ساتھ رونے والی — وہی میں وہی مرا دل وہی مشورے خیالی

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

مرے گھر میں کیوں خموشی مرے دل پہ کیوں تباہی — یہ مکاں ہے یا کہ صحرا میں مکیں ہوں یا کہ راہی
در و بام پر ہے یکسر شب گور کی سیاہی — میں ہوں زندہ یا کہ مردہ مجھے کیا ہوا الٰہی

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے !

میں کسے یہاں پکاروں کہ نہیں نشاں کسی کا — نہ قدم کی کوئی آہٹ نہ گذر یہاں کسی کا
ہے جہاں میں کوئی مونس کوئی رازداں کسی کا — ہے مکیں یہاں کا تنہا یہ بھی ہے مکاں کسی کا

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

میں ہوں گھر میں یوں سفر میں کوئی جیسے بلبوا ہو — اُتر آئی شامِ غربت وہ غریب تھک گیا ہو
نہ تو ہم سفر ہو کوئی نہ تو کوئی رہ نما ہو — وہیں بیٹھ جائے حیراں یہی دل میں کہہ رہا ہو

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

مجھے دی مری قضا نے شبِ غم کی میزبانی — مجھے کھلائے، یہ بھی ہو گی کوئی رسمِ میہمانی ؟
میری جانِ زار حاضر مگر آہ ناتوانی ! — کہیں دہر میں نہ پھیلے میرے بخل کی کہانی

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

ترے رحم سے بسر ہو یہ شبِ محن الٰہی ! — نظر آئے پھر کسی کی مجھے انجمن الٰہی !
مری روح چھوڑ جائے نہ دیارِ تن الٰہی — کہیں دامنِ شبِ غم نہ بنے کفن الٰہی

شبِ غم بری بلا ہے، شبِ غم بری بلا ہے

قوم پرست مسلم کا ترانہ

قوم کی الفت کوئی مجھ سے چھڑا سکتا نہیں
میں قدم اس راہ سے پیچھے ہٹا سکتا نہیں

اُمّتِ احمد کی الفت میرے آب وگل میں ہے
غیر قوموں سے کبھی میں لَو لگا سکتا نہیں

خیر خواہی قوم کی بس دین و مذہب ہے مرا
میں یہ اپنا دین دنیا سے چھپا سکتا نہیں

عشقِ ملت کا ہے جذبہ میرے دل میں موجزن
کوئی اس جذبہ کی قوت کو دبا سکتا نہیں

آستانِ مصطفٰے پر ہے جھکایا میں نے سر
غیر کے در پر میں اس سر کو جھکا سکتا نہیں

آگ میرے دل میں ہے اس عشق کی بھڑکی ہوئی
اس کے شعلوں کو سمندر بھی بجھا سکتا نہیں

میں ہوا مدہوش ہوں پیکر شرابِ عشق کی
ہوش میں صورِ قیامت مجھ کو لا سکتا نہیں

موت منہ کھولے ہوئے ہو گرچہ میری راہ میں
خدمتِ اسلام سے میں جی چرا سکتا نہیں

قوم کی الفت رہے گی دل میں گرمائی ہوئی !
آفتیں ہوں گرچہ میرے سر پہ منڈلاتی ہوئی

گرچہ باغ وراغ میں سبزہ لہکنا چھوڑ دے
گل مہکنا چھوڑ دے بلبل چہکنا چھوڑ دے

آب وآتش کی ہو خاصیت میں ایسا انقلاب
آب بہنا چھوڑ دے آتش بھڑکنا چھوڑ دے

عادتیں موجوں کی اور شعلوں کی بھی جائیں بدل
موج اُبھرنا چھوڑ دے شعلہ لپکنا چھوڑ دے

باغ میں ایسا تغیر ہو کہ جب آئے بہار
پھول کھلنا چھوڑ دے غنچہ چٹکنا چھوڑ دے

موسمِ گل میں ہوا بھی گر درختوں پر چلے
پتہ ہلنا چھوڑ دے ٹہنی لچکنا چھوڑ دے

دھوپ میں مہر درخشاں کے نہ ہو تیزی کبھی
چاندنی ماہ منور کی چٹکنا چھوڑ دے !

آئے جب برسات ہو اس کا تماشا بھی نیا
ابر گھرنا چھوڑ دے بجلی چمکنا چھوڑ دے

حالتوں میں دیدہ و دل کے بھی آجائے خلل !
آنکھ کی پتلی تھرکنا دل دھڑکنا چھوڑ دے

سطح پر دریا کے بھی اٹھے نہ کوئی بلبلہ
فرش پر مخمل کے بھی موتی ڈھلکنا چھوڑ دے

چھوڑ دے آنسو بہانا شمع سوزاں بزم میں — آئینہ حیرت سے منہ ہر اک کا تکنا چھوڑ دے

لیکن اپنی قوم کی دُھن میں نہ چھوڑوں گا کبھی
قوم کی خدمت سے منہ اپنا نہ موڑوں گا کبھی

گرچہ بادِ صبح گاہی سرسرانا چھوڑ دے — صبح کا تارا فلک پر جھلملانا چھوڑ دے
دامِ ظلمت کا بچھانا چھوڑ دے گو وقتِ شام — روشنی وقتِ سحر کا مسکرانا چھوڑ دے
گو جگانا چھوڑ دے سبزہ کو بارانِ بہار — اور کلیوں کو ہوا بھی گدگدانا چھوڑ دے
چھوڑ دیں اپنی روانی نہر کی لہریں اگر — اور شادابی سے کھیتی لہلہانا چھوڑ دے
گرچہ پھولوں کے شگوفے چھوڑ دیں ہنسنا تمام — مرغ خوش الحاں چمن میں چہچہانا چھوڑ دے
چھوڑ دے گو ابر بار ہونا اشکبار ! — آسماں پر برق مضطر تلملانا چھوڑ دے
گرچہ قمری چھوڑ دے فریاد کرنا سرو پر — اور کبوتر مست ہو کر بغبغانا چھوڑ دے
چھوڑ دے گو خود بخود جلنا پہاڑوں پر چنار — بیدِ مجنوں جنگلوں میں تھرتھرانا چھوڑ دے
کپکپانا چھوڑ دے سردی سے گو جسمِ بشر — چہرہ گرمی کے اثر سے تمتمانا چھوڑ دے
برف جمنا چھوڑ دے سردی کے موسم میں اگر — دھوپ گرمی کے دنوں میں چلچلانا چھوڑ دے

میں نہ چھوڑوں گا مگر غمخواری اپنی قوم کی !
ہے مجھے مدِ نظر بیداری اپنی قوم کی

گو کرن سورج کی دریا میں مچلنا چھوڑ دے — دشت میں ریگِ رواں کروٹ بدلنا چھوڑ دے
کاربن کو جذب کرنا چھوڑ دے گو ہر شجر — آکسیجن کی مدد سے آگ جلنا چھوڑ دے
گرچہ پانی چھوڑ دے اڑنا ہوا پر بن کے بھاپ — برف چوٹی سے پہاڑوں کی پھسلنا چھوڑ دے
مشک بھرنا چھوڑ دے گو ناف میں آہوئے چیں — اور زمیں کی کان منہ سے لعل اگلنا چھوڑ دے
چھوڑ دے فولاد کھنچنا گرچہ مقناطیس سے — موم تاثیرِ حرارت سے پگھلنا چھوڑ دے
گرچہ حرکت سے حرارت چھوڑ دے ہونا عیاں — برق مقناطیس کے سانچے میں ڈھلنا چھوڑ دے

گرچہ اڑنا چھوڑ دے غبارہ زورِ برق سے گیس کی قوت سے موٹر کار چلنا چھوڑ دے
چھوڑ دے گو دوڑنا آواز ٹیلیفون پر اور گراموفون سے نغمہ نکلنا چھوڑ دے
لاوہ بہنا چھوڑ دے گو کوہِ آتش خیز سے بحر سے فوارۂ آبی اچھلنا چھوڑ دے
چھوڑ دے گرنا فرازِ کوہ سے گو آبشار آتشیں چشموں میں گو پانی ابلنا چھوڑ دے

میں مگر ہرگز نہ چھوڑوں گا رفاقت قوم کی
مٹ نہیں سکتی مرے دل سے محبت قوم کی

چھوڑ دے ہر چیز گو اپنی روش اپنا عمل قوم کی الفت نہ میں چھوڑوں گا بے لیت و لعل
قوم کا دامن نہیں چھوڑوں گا اپنے ہاتھ سے گرچہ آویزاں میرے سر پہ ہو شمشیر اجل
جو محبت اور تعلق قوم سے رکھتا ہوں میں وہ محبت ہے امٹ اور وہ تعلق ہے اٹل
قدرتی جذبے میں جتنے گرچہ وہ پڑ جائیں سست جذبۂ قومی میں میرے آ نہیں سکتا خلل
قوم کی خدمت میں جھیلوں آفتوں پر آفتیں لیکن ان سے آ نہیں سکتا مرے تیور پہ بل
میں نہ گھبراؤں گا خطرات و مصائب سے کبھی گرچہ ان فوجوں کے ٹوٹیں مجھ پہ آ کر دل کے دل
خاک سے میری صدا آئے گی حبِ قوم کی! گردشِ افلاک دے گر میری ہستی کو کچل
عشقِ ملت میں رہوں گا ہر طرح ثابت قدم میں نہ بدلوں گا زمانہ مجھ سے گر جائے بدل
کعبۂ ملت کے حج پر میں نے باندھی ہے کمر کیوں نہ اس راہِ مقدس میں چلوں میں سر کے بل
دھار پر تلوار کی جاتا ہوں رکھتا میں قدم پر نہیں ممکن قدم اس راہ سے جائے پھسل

جو چلیں میری طرح اس راہ میں ہو کر دلیر
جان و دل اور دولت و راحت سے لیں منہ اپنا پھیر

رباعی

لیڈر رہو مگر دین سے ان بن کیا خوب اسلام کو تم کرو گے روشن کیا خوب
اسٹیم اسلام کا نہیں جس میں گاڑی کو چلائے گا وہ انجن کیا خوب

میں کیا ہوں؟

تابعِ احکام قرآنی ہوں میں ! | پیرو دینِ مسلمانی ہوں میں
رونقِ اسلام میرے دم سے ہے | روشنیٔ شمعِ ایمانی ہوں میں
مجھ سے ہے علمِ تصوف کا وجود | واقفِ اسرارِ روحانی ہوں میں
شوق سے کرتا ہوں سجدے رات دن | یعنی پیشانی ہی پیشانی ہوں میں
معتکف حجرے میں رہتا ہوں مدام | غوث ہوں یا قطب ربانی ہوں میں
آ گیا ننیانوے کے پھیر میں | حافظِ اسمائے یزدانی ہوں میں
میں ہوں دل سے مومنوں کا جاں نثار | کافروں کا دشمن جانی ہوں میں
آ گئی ہے عاجزی مجھ کو پسند | آگ تھا پہلے تو اب پانی ہوں میں
نفس امارہ کا دشمن بن گیا | یہ جو روسی ہے تو جاپانی ہوں میں
جان و دل سے شیفتہ ہوں قوم پر | مفت کا صدقہ ہوں قربانی ہوں میں
کیوں نہ دردِ قوم کا دورہ اٹھے | غم گسارِ نوعِ انسانی ہوں میں
دوسروں کی چوٹ سے دکھتا ہے دل | واقفِ آزارِ جسمانی ہوں میں
مجھ سا مردِ باخدا اب کون ہے | بے بدل ہوں آج لاثانی ہوں میں
دیکھنا دھوکا نہ کھا جانا کہیں | صبح کاذب کی درخشانی ہوں میں
ہوشیار اے اہلِ دنیا ہوشیار | افترا و مکر کا بانی ہوں میں
میری نیت میں نہیں مطلق خلوص! | مبتلائے حظِ نفسانی ہوں میں
میری بھولی شکل پر جانا نہ تم ! | دھار ہوں خنجر کی عریانی ہوں میں
کاٹتا ہوں بھائیوں تک کے گلے | ہند میں تیغِ صفاہانی ہوں میں
شاذ و نادر ہوگا مجھ سا کوئی اور | مثلِ نادر شاہ درانی ہوں میں

مجھ سے ہے لیلائے دنیا کا یہ قول — میں کہ مجنوں تیری دیوانی ہوں میں
میری یہ ریشِ مقدس واہ واہ — خضر ہوں الیاس کا ثانی ہوں میں
کام آجاتی ہے اس ٹٹی کی آڑ — اک مجسم شکلِ شیطانی ہوں میں

اے وجاہت ہے یہ میرا اصل حال
سچ ہے یہ ننگِ مسلمانی ہوں میں

عید پیچھے ٹر

اے ہم نشیں نہ پوچھ مری سرگزشتِ صوم — مجھ سا جہاں میں نہ کوئی روزہ دار تھا
چمکا جب آسماں پہ ہلالِ مہِ صیام — اس روز مجھ کو صبح سے ہلکا بخار تھا
ایسے میں روزہ رکھنے کی ہمت نہ ہو سکی — لاغر تھا ناتواں تھا نحیف و نزار تھا
یہ خوف تھا کہ بھوک سے بڑھ جائے گا مرض — عذرِ شکستِ صوم غرض آشکار تھا
روزہ پہ روزہ کھانے لگا ہو کے شوخ چشم — فاقہ پہ فاقہ سخت مجھے ناگوار تھا!
لیکن شکستِ صوم سے مشکل یہ آپڑی — سمجھا یہ خلق نے کہ میں پرہیزگار تھا
کہتے تھے مولوی بھی مجھے چند سادہ لوح — جن کی نگاہ میں مجھے حاصل وقار تھا
وہ جانتے تھے قطب مجھے اپنے وقت کا — جو صائم النہار تھا شب زندہ دار تھا
حالانکہ نامہ تھا مرے اعمال کا سیاہ — اور دامنِ ضمیر مرا تار تار تھا
اللہ رے شوخ چشمیٔ نفسِ ستم ظریف — اس حال میں بھی میں نہ ذرا شرمسار تھا
دل سے یہ چاہتا تھا کہ پردۂ فاش ہو — دیندار کہلوانے کا امیدوار تھا
جاتا تھا روز جلسۂ افطارِ صوم میں — حالانکہ پہلے روزہ سے میں روزہ خوار تھا
بڑھ چڑھ کے روزہ داروں سے وقتِ غروبِ شمس — نقارے اور اذاں کا مجھے انتظار تھا
میں دیکھتا تھا اپنی گھڑی کو گھڑی گھڑی — افطارِ صوم کے لئے دل بے قرار تھا

آتی تھی جب صدائے اذاں میرے کان میں ۔۔۔ کھانے پہ ہاتھ مارتا دیوانہ وار تھا!
انتیس ۲۹ دن گزار دیئے میں نے اِس طرح ۔۔۔ آخر تو عقل مند تھا اور ہوشیار تھا
انتیسویں کو دیکھ کے شکلِ ہلالِ عید ۔۔۔ میری دلی خوشی کا نہ حد و شمار تھا
میں جانتا تھا قید سے مجھ کو ملی نجات ۔۔۔ گو اس سے پیشتر بھی نہ بے اختیار تھا
احباب کو روانہ کئے لکھ کے عید کارڈ ۔۔۔ جن پر عجیب رنگ کا نقش و نگار تھا
ہے اپنی کامیابیٔ باطل پہ مجھکو ناز! ۔۔۔ ثابت یہ کر دیا ہے کہ میں روزہ دار تھا
مانا کہ اب نہیں کوئی قاضی و محتسب ۔۔۔ مانا کہ ہر طرح کا مجھے اختیار تھا
مانا کہ حدِّ شرع بھی جاری نہ ہو سکی ۔۔۔ اپنے عمل کا آپ ہی میں ذمہ دار تھا
لیکن خدا تو حاضر و ناظر ہے ہر گھڑی ۔۔۔ وہ جانتا ہے جو مرا طرز و شعار تھا

پتھر پڑے کچھ ایسے مری عقل و فہم پر
خوفِ نبی نہ بیمِ خداوندگار تھا!

الوداع (اکبر الہ آبادی)

آگیا وقتِ اجل اے شوقِ دنیا الوداع ۔۔۔ الوداع اے حسرتِ دل اے تمنّا الوداع
الوداع اے ساقیٔ مے خانۂ طولِ امل ۔۔۔ اے سرورِ بادۂ امیدِ فردا الوداع
اے خمِ محرابِ ایوانِ خوش آئیں الوداع ۔۔۔ اے شکوہِ رفعتِ قصرِ معلّیٰ الوداع!
الوداع اے مسند و فرش و قبا و پیرہن ۔۔۔ اے حریر و اطلس و کمخواب و دیبا الوداع
الوداع اے رنگِ وقتِ الوداع اے فرطِ شوق ۔۔۔ رخصت اے جوشِ جنوں و سیرِ صحرا الوداع
الوداع اے جلوۂ نیرنگیٔ حسنِ بتاں ۔۔۔ اے خیالِ عارض و زُلفِ چلیپا الوداع
الوداع اے عالمِ نیرنگیٔ باغِ جہاں! ۔۔۔ اے نگاہِ دیدۂ محوِ تماشا الوداع
عازمِ ملکِ عدم ہے اکبر خونیں جگر! ۔۔۔ الوداع اے عمر اے بزمِ احبّا الوداع

شمعِ خاموش

اے شمع بہت ضبط کیا رازِ نہانی
شاہد ہے تحمل پہ ترے اشک فشانی
سنتے ہیں تری مدح یہ لوگوں کی زبانی
ہے عاشقوں کے دل میں توہی صبر کا بانی
تو محفلِ عشرت کے لئے زیب فضا ہے
اور دیدۂ حق بیں کے لئے راہ نما ہے

پروانے خموشی پہ تری ہوتے ہیں قربان
دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی تجھے انساں
رہتی ہے ضیا چار طرف تیری نمایاں!
یا رات کو نکلا ہوا ہے مہرِ درخشاں!
محفل میں اگر رات کو جلوہ نہ ہو تیرا
ہو جائے قیامت رہے ہر سمت اندھیرا

کر جائے اگر دم قفسِ جسم سے پرواز
آئے نہ کبھی تیری زباں تک سخنِ راز
ایسا ہی ترا سوز ہے ایسا ہی ترا ساز
جس طرح سے گھٹ گھٹ کے مرے عاشق جانباز
کچھ تجھکو غرض ہی نہیں دنیا کی ہوا سے
لو تیری لگی رہتی ہے ہر وقت خدا سے

ہے تیری خموشی میں بھی اک قسم کی تقریر
دل سوختہ رہتے ہیں سدا تجھ سے سبق گیر
پھیلی ہے زمانہ کے دلوں میں تری تاثیر
گویا تو بنی ہے ہمہ تن جذب کی تصویر
بہلاتی ہے خلوت میں دلِ عاشقِ کامل
محفل میں تجھے کہتے ہیں آرائشِ محفل

اِس سوز میں بن جاتی ہے اگرچہ تری جاں پر
لاتی نہیں پر حرفِ شکایت کو زباں پر
روشن ہے ترا ضبط تو اے شمع جہاں پر
حالت تری موقوف نہیں میرے بیاں پر
حق یہ ہے کہ حصّہ ترا ہے ضبط نہانی
یوں سینکڑوں کرتے ہیں عیاں عشق زبانی

تو کرتی ہے عالم میں سر شام سے شاہی ہے ماہ نشاں تیرا تو انجم ہیں سپاہی
اللہ رے اے شمع تری عدل نگاہی! غالب نہیں آتی ہے سفیدی پہ سیاہی
تا صبح جہاں سارا ترے زیر نگیں ہے
اور تیرا لقب مالکۂ روئے زمیں ہے

یہ سچ ہے کہ تو مانع ہر رنج و تعب ہے محفل میں ترے دم سے یہ سب عیش و طرب ہے
تنویر تری جلوہ فزائے رُخ شب ہے نظارے کا بس تو ہی مسبب ہے سبب ہے
دیکھا ہے جسے تیرے رُخ روشن پہ فدا ہی
تیرا تو ہر انداز زمانے سے جدا ہے

کرتی ہے تو ایسوں کی لحد پر بھی اُجالا جس کا نہیں دنیا میں کوئی پوچھنے والا
حق نے تجھے اُن لوگوں کا ہمدرد نکالا جو ہیں دہن گور کا مدت سے نوالا!
یکساں ترا احسان ہے نیکوں پہ بدوں پہ
چار اشک بہاتی ہے تو ان کی لحدوں پہ

کچھ ایسی پسند آئی تجھے صبر کی لذت گلگیر سے بھی تو نہیں کرتی ہے شکایت
تیرا ہی کلیجہ ہے یہ ہے تیری ہی ہمت شاباش یہی چاہئے اندازِ محبت
آنسو جو ٹپک پڑتے ہیں کچھ جوش بکا سے
تو ان کو چھپا لیتی ہے دامانِ حیا سے

اے شمع نہاں تجھ میں جو ہے سوز و صبوری تڑپاتی ہے تجھکو کسی معشوق کی دوری
بے شبہ غم ہجر میں جلنا ہے ضروری! لاریب کہ تو بھی ہے بڑی عشق کی پوری
اشہر جو نظر آتا ہے یہ منظر ہجرت
یاد آتی ہے فوراً کسی مہجور کی حالت

دستِ سوال

دستِ سوال لاکھوں ہی عیبوں کا عیب ہے
جس ہاتھ میں یہ عیب نہ ہو دستِ غیب ہے

فقیروں نے لوٹا ہے ہندوستاں کو
کوئی کہنے والا نہ یاں سننے والا

انہیں ہر طرح مانگ کھانے سے مطلب
کہ رزقِ مقدر ہے منہ کا نوالا

وہ نعم الرجل ہے جو دے ڈالے تھیلی
وگرنہ ہے انکار کو حرف لالا

کوئی حاجی صاحب۔ بریش مقدس
یہ شکل اور سائل یہ منہ اور مسالا

کوئی مدرسہ کے لئے دربدر ہے!
کوئی مسجدوں کے لئے پھیری والا

کسی کا وظیفہ سخی کی دعائیں
کسی کی زباں پر دیئے کا اُجالا

کوئی حامی بیواؤں کا بچوں کا کوئی!
پڑا ہے کسی کو یتیموں سے پالا

کوئی نانی اماں کو پکڑے ہوئے ہے
لئے پھرتا ہے کوئی مصنوعی خالا

عرب ہے کوئی باعبائے مکلف
دعا لب پہ ہے بارک اللہ تعالےٰ

بغل میں کسی کے ہے تھیلی ٹکوں کی
مگر ہاتھ میں جھوجھرہ سا پیالا

کوئی ڈھولکی والے ہیں پیرزادے
گویّوں سے جن کا ہوا بول بالا!

اُچھل کود کا حال کیا پوچھتے ہو!
بزرگوں کا اپنے بڑا نام اُچھالا

کسی نے دبائی ہے شیخی بغل میں
کسی نے عصائے مشیخت سنبھالا

کوئی بن کے مولود خواں ہے سفر میں
کہیں قورما ہے کہیں ساگ اُبالا

کسی کی گدائی ہے روزی کی کنجی
اندھیرے اُجالے قفل توڑ ڈالا

رئیسوں میں چکر لگاتا ہے کوئی
مہذب بھکاری ہوں اخبار والا

طمع نے کسی کو بنایا ہے پنڈت
روپے دھیان میں ہاتھ میں گیان مالا

کوئی ہو کے مقروض سائل ہوا ہے
قبیلہ بہت ہے گرو ہے قبالہ

کوئی ہے فلاں شیخ صاحب کا پوتا | کوئی ہے فلاں میر صاحب کا سالا
کسی نے بنائے ہیں جھوٹے تبرک | کہ ہے جھوٹ کھانے کمانے کا آلا
کسی کی ہے کوڑی دکان آٹھویں دن | ہوا رفتہ رفتہ یوں ہی کوڑیالا
کسی مولوی نے کسی پیر جی نے | قدم جب کمائی کو گھر سے نکالا !
کہا وعظ یا جھوٹے پیروں کے قصے | کلیدِ زباں سے کھلا بند تالا !
کہیں سے ملا نقد کپڑا کہیں سے | کہیں سے تو کمبل کہیں سے دوشالا
کسی نے دیا یادگار اپنا چھلا | کسی بیوہ عورت نے سونے کا بالا
کوئی ہے مسافر کوئی بے وطن ہے | کوئی حج اجمیر کو جانے والا ! !
کوئی کاشمیری ہے پورب کا کوئی ! | کوئی گورا گورا کوئی کالا کالا
غرض بھیک کے ٹکڑے اور سینہ زوری | ستم ہم نے ایسا نہ دیکھا نہ بھالا
حرام آتی ہیں مانگنے کی یہ شکلیں | کلوا ایّھا النّاس رزقاً حلالا

غضب ہے کہ سائل ہیں آپ ہٹے کٹے
جوانی کو ان کے غضب کا حوالا

بے ثباتی عالم

کبھی مفلس کو ان آنکھوں نے دیکھا ہی غنی ہوتے | کبھی اہلِ دوَل کو ہم نے بے اسباب دیکھا ہے
کبھی تالاب کو دیکھا ہے ہم نے خشک ہو جاتے | کبھی دریا میں آتے یک بیک سیلاب دیکھا ہے
کبھی محوِ طرب یاروں کو دیکھا بزمِ شادی میں | کبھی احباب کو با دیدۂ پر آب دیکھا ہے
کبھی فصلِ بہاری میں بھی افسردہ چمن پایا | کبھی فصلِ خزاں میں نخل کو شاداب دیکھا ہے
کبھی دیکھا ہے جن کو بوریا مشکل سے ہاتھ آیا | انہیں کے گھر میں فرشِ قاقم و سنجاب دیکھا ہے
بہت دن گٹ رہے ہیں اوج اس قصرِ طلسمی میں | بہت کم ہم نے حالِ عالمِ اسباب دیکھا ہے

اتفاق

پوچھا کسی نے جا کے فلاطوں سے ایک بار اے مایۂ ذکاوتِ خرد فخرِ روزگار!
کیا شے ہے جو بڑھاتی ہے قوموں کا اقتدار کیا چیز ہے جو خلق میں کرتی ہے شرمسار
بولا کہ منزلت کا سبب اتفاق ہے
حاصل ہو جس سے شرم و ندامت نفاق ہے

قوموں نے اتفاق سے پائی ہے آبرو نام اتفاق سے ہے قبائل کا چارسو
تھا قطرہ قطرہ آج رواں ہے جو آبِ جُو ایک ایک حرف مل کے ہوئی شرحِ گفتگو
یک جا کھلے جو پھول تو گلزار ہو گیا
ہم رشتہ چند گل جو ہوئے ہار ہو گیا

انجم کے اتفاق سے پروین کی ہے یہ تاب خوشے تھے چند رز کے جو اب ہے شراب ناب
یک جائی سطور سے کہلائے فصل و باب کچھ فصل و باب جمع ہوئے ہو گئی کتاب
ایک ایک لمحہ مل کے مہ و سال ہو گیا
اک اک درم سے گنج زر و مال ہو گیا

مبنی ہے اتفاق پہ عالم کا انتظام! دنیا کا اتفاق سے وابستہ ہے قیام
ارض و فلک ہوا مہ و خورشید لاکلام نظم جہاں کا مل کے بہم کر رہے ہیں کام
جب فرق اتفاق دعو امل میں آگیا
رنگِ فنا زمین و زماں سب پہ چھا گیا

اے قوم یاد ہے تجھے کچھ اپنی ابتدا دنیا میں تیری جہل و ضلالت کا زور تھا
فسق و فجور کی ترے کچھ تھی نہ انتہا! جاہل لقب تھا تیرا زمانے میں برملا
شہرہ ترے نفاق کا سارے جہاں میں تھا
پائے گی تو عروج یہ کس کے گماں میں تھا

تھا کس کو یہ گماں کہ ترقی کرے گی تو! — کس کو تھا یہ خیال کہ اتنی بڑھے گی تو
شاہان ذی وقار سے یوں تاج لے گی تو — کرکے جہاں کو تابع فرماں رہے گی تو
سطوت کا اپنی رعب جہاں پر بٹھائیگی
یوں بحر و بر کو تیغ سے قبضہ میں لائیگی

کس نے کیا تھا تجھکو فراست سے بہرہ ور — تھا کون جس نے تجھکو سکھائے یہ سب ہنر
کس نے کیا علوم سے بھا تجھکو بہرہ ور — کس نے چڑھا دیا تھا ترقی کے بام پر
وہ روحِ اتفاق جو پھونکی نبیؐ نے تھی!
شوکت تری جہاں میں بڑھائی نبیؐ نے تھی

اے قوم تجھ میں شرط تھی جب اتفاق کی — ہر دل میں روشنی تھی عجب اتفاق کی!
تعلیم دے رہا تھا ادب اتفاق کی! — لاریب برکتیں تھیں وہ سب اتفاق کی
پایا تھا تو نے نشو و نما اتفاق سے
عالم میں تیرا غلغلہ تھا اتفاق سے!

فتح و ظفر کی راہ کا رہبر ہے اتفاق — دولت اگر ہے قوم کا تن سر ہے اتفاق
اہل ذکا و فہم کا اس پر ہے اتفاق — لاکھوں تفنگ و تیغ سے بڑھکر ہے اتفاق
پہلا سا تم میں آج بھی گر اتفاق ہو
حاصل وہی جلال وہی طمطراق ہو!

مسلکِ رنداں

مجھے تو رات کو ساقی کی یہ ادا بھائی — کہ پہلے پینے سے مے خاک پر چھڑکوائی
جو میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ سودائی — تو یادِ تیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد دار محبانِ بادہ پیمارا!

اور ہم

(عالیجناب حکیم الطاف حسین صاحب آزاد سہارنپوری)

قعر گرداب بلا ہے اور ہم ! | پستیٔ تحت الثریٰ ہے اور ہم
راستہ پُر پیچ و منزل پر خطر | رات ہے کالی گھٹا ہے اور ہم
جس طرف جاؤ ستم کا سامنا | لطمۂ موجِ ہوا ہے اور ہم
جس طرف جاؤ تباہی رونما | جوششِ طوفانِ بلا ہے اور ہم
کیا مآلِ کار نکلے کیا خبر | عالمِ بیم ورجا ہے اور ہم
اُف خلش ہے خارِ غم ہے اور دل | اُف تپک ہے آبلہ ہے اور ہم
قوم پامالِ ہلاکت کیوں نہ ہو | ترکِ احکامِ خدا ہے اور ہم
شرمِ دنیا ہے نہ خوفِ عاقبت | ہر روا و ناروا ہے اور ہم
بیمِ رسوائی نہ فکرِ آخرت | ہر سزا و ناسزا ہے اور ہم
رات دن سودائے دنیا خبطِ جاہ | غلبہ حرص و ہوا ہے اور ہم
دوست کو ہم سے نہ دشمن کو نباہ | شیوۂ مکر و دغا ہے اور ہم
ظاہر و باطن مکدّر ہے تو ہو | دعوئے خذ ما صفا ہے اور ہم
سینکڑوں اوہامِ باطل دلنشیں | قلعۂ پادر ہوا ہے اور ہم
صنعت و حرفت کا دامن چھوڑکر | جستجوئے کیمیا ہے اور ہم !
کوشش و تدبیر سے مُنہ موڑکر | بدنصیبی کا گلہ ہے اور ہم !
کچھ غمِ دنیا و ما فیہا نہیں | غفلتِ بے انتہا ہے اور ہم
حال کی پرواہ نہ استقبال کی | طبعِ نکبت آشنا ہے اور ہم
جو ہمیں کرنا تھا گویا کر چکے | فرصتیں ہیں سو فنا ہے اور ہم
دیکھئے کتنے بچیں کتنے مریں | جہل کی مہلک ہوا ہے اور ہم
دیکھئے زندہ رہیں یا چل بسیں | مفلسی کا کالرا ہے اور ہم

آہ اپنی عام افسردہ دلی! حال مایوسی فزا ہے اور ہم
آہ اپنی غایتِ بے چارگی ناامیدی کا گڑھا ہے اور ہم
اِک مصیبت ہو تو اس کو سہہ سکیں آفتوں کا سلسلہ ہے اور ہم
اک طرف ساری خدائی، کل جہاں اک طرف صرف اک خدا ہے اور ہم
پک گیا بالکل کلیجہ پک گیا طعنۂ ماوشما ہے اور ہم
دل جگر چھلنی نہ ہوں کیونکر نہ ہوں بارشِ تیرِ جفا ہے اور ہم
جسطرح بتیس ۳۲ دانتوں میں زباں غیر قوموں کا جتھا ہے اور ہم
فکرِ پامالی ہے اور ابنائے ملک ہم وطن ہیں اور دغا ہے اور ہم
غیر ہیں اور کوشش غصبِ حقوق کُند خنجر ہے گلا ہے اور ہم!
بھائی کے بھائی قصائی کے قصائی نرغۂ اہلِ دغا ہے اور ہم!
خود تو مفسد ہم پہ الزام فساد مفتری ہیں افترا ہے اور ہم
جبر ہے ظلم وستم ہے اور حریف صبر ہے شکرِ خدا ہے اور ہم
بدمعاشی اور اقوامِ ذلیل ذلتوں کی انتہا ہے اور ہم!
لاکھ پامالِ ستم ہوں غم نہیں منظرِ حیرت فزا ہے اور ہم
اب نہ وہ جرات نہ وہ خودداریاں اِدّعا ہی اِدّعا ہے اور ہم

لمعات اکبر الہ آبادی مرحوم

دنیا کی طمع میں وہ پھسلا، اور میں نے خدا کا نام لیا
لغزش سے وہ خاک آلودہ ہوا، اور صبر نے مجھکو تھام لیا
ظاہر کا ادب ملحوظ رہا، باطن بھی مگر محفوظ رہا!
واعظ سے اُدھر اک بات سُنی، ساقی سے اِدھر اک جام لیا

بت بے وفا

مہرباں آج مقدر سے وہ دلدار ہوا لطف فرما مری حالت پہ ستمگار ہوا
رونق افروز مرے گھر میں مرا یار ہوا بخت سوتا تھا بہت روز سے بیدار ہوا
شکر صد شکر مری اوج پہ تقدیر ہوئی
جذب الفت میں ہوا آہ میں تاثیر ہوئی

آج پہلو میں مرے کون ہے وہ ماہ لقا بخت خفتہ ہوا بیدار نصیبا چمکا!
صبر عاشق کا خوشا بخت نتیجہ نکلا! سوزشِ دل نے مری ایک جہاں پھونکدیا
تیر نالوں سے جو پہنچے مرے برچھی ہوکر
رہ گیا چرخِ ستمگار بھی چھلنی ہوکر

دیکھکر اس دلِ نازک میں محبت کا اثر پاکے اس شوخ ستمگر کے تلطّف کی نظر
اس طرح کی دلِ بے تاب کو اس بت کی خبر غیرتِ حورِ جناں، رشکِ پری رشکِ قمر
اب یہ زیبا نہیں تجکو ستم ایجاد کہوں
مار ڈالا ہے مجھے تونے میں جلاد کہوں

اتنا سنتے ہی ہوا آگ بگولا کافر شکوۂ جور ہوا ایسا خلافِ خاطر
اٹھکے پہلو سے الگ بیٹھ گیا وہ آخر اُف رے عیار دغاباز جفا جو ساحر
قسمیں کیا کیا نہ ستمگر کو دلائیں میں نے
باہیں گردن کی طرف روکے بڑھائیں میں نے

لاکھ منت کی الگ ہی بتِ مغرور رہا پاس آیا نہ جفاکار کھڑا دور رہا
کیا کہوں تم سے کہ میں کس لئے معذور رہا موت بھی لینے نہ آئی مجھے مجبور رہا
روکے قدموں پہ گرا میں تو خطاوار ہوا
میری منت سے وہ بت اور بھی بیزار ہوا

کیا قیامت ہے مجھے چھوڑ کے دلدار چلا — سنگدل بانیٔ بیداد، دل آزار چلا
ہائے وہ قاتلِ سفاک مجھے مار چلا — مڑ کے اتنا بھی نہ دیکھا کہ یہ بیمار چلا
اُس کو منظور یہ ہے عمر تڑپ کر کاٹے
صورتِ شمع جلے رات یہ رو کر کاٹے
صبح ہوتے نہ اسے پھر کوئی پائے باسط — غمِ جاں کاہ اسے ایسا گھلائے باسط
گور پر اس کی کبھی گر کوئی جائے باسط — لوحِ مرقد پہ یہ لکھا ہوا پائے باسط
بت ہیں گر شہرۂ آفاق جفا کاری میں
نام رہ جائے گا اپنا بھی وفاداری میں

۲/۳

شش جہت نہ فلک آئیں گے نظر ۲/۳ — ۶/۹ کے برابر ہے اگر ۲/۳ !
دو کھلونے جو کبھی ہم نے تپائی پہ دھرے — آ گئے صاف مہندس کو نظر ۲/۳
بیسویں رات مہینے کی جب آجاتی ہے — غم میں رہ جاتا ہے گھل گھل کے قمر ۲/۳
ظالموں خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر — لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر ۲/۳
طالبِ خیر نہ ہوں گے کبھی انسان سے ہم — نام ہے اس کا بشر اس میں ہے شر ۲/۳
منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی — دیکھ لو زور میں موجود ہے زر ۲/۳
ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون — جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر ۲/۳
تیسرا حصہ مرے بال رہے جب کالے — میں سمجھا کہ گئی عمر گزر ۲/۳
کھوئی منزل تو کہے دیتی ہے اے شامِ شباب — رہ رو کا ابھی باقی ہے اثر ۲/۳
۲/۳ کی رکھی جو اے جوش ردیف
شعر بھی نکلے ہیں مقبولِ نظر ۲/۳

فلسفۂ زندگی - (اقبال)

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی — اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی — ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں — جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگین دل کی داستان — نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغان

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ غم کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے — راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے — جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ یار نہیں — جلوہ پیرا جس کی شب میں خون کے آنسو نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا — جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے — عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

گو بظاہر تلخیٔ دوراں سے آرامیدہ ہو — زندگی کا راز اس کی آنکھ میں پوشیدہ ہے

اے کہ نظمِ دہر کا ادراک حاصل ہے تجھے — کیوں نہ ہو آساں غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — ظلمتِ ہستی میں یہ سورج سدا تابندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر — جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں — روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی — زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آئی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پہ یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پہ پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہیں نہرِ رواں اور زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

میں اور میری قوم - (اقبال)

ہو چکا اے قوم تیرا آشیاں برباد اب
زندگی کا دم ہے زیرِ دامنِ صیاد اب

اے میری قوم ناز میں تیرے اٹھاؤں گا
گل ہیں ہزار کھاؤں گا اور گل کھلاؤں گا

کب تک نہ دیگی نالۂ بلبل کا کچھ جواب
اے گلبدن فسانۂ خزاں کا سناؤں گا!

ہے تجھ میں خوئے شمع تو پروانہ بن کے میں
جلنے کو جل بجھوں گا یہ جوہر دکھاؤں گا

دیکھوں گا کیسے نیند سے تو جاگتی نہیں
خوب آج گدگداؤں گا پاؤں دباؤں گا

تیرا لہو سفید جو شیریں ادا ہوا
میں جوئے شیر کوہکنی کر کے لاؤں گا

جاگی نہ تو تو صورِ اسرافیل کی طرح
نالوں سے اپنے شورشِ محشر مچاؤں گا

ثابت قدم ہوں مجھکو قسم ربِ پاک کی
چیروں گا کوہ و دشت بیاباں ہلاؤں گا

ٹیکا سمجھ کے میں ترے بختِ سیاہ کو
عین الکمال برزخ دنیا دکھاؤں گا

عاشق کی زندگی ہے خط و خال دیکھنا
اور میری زندگی ترا اقبال دیکھنا!

دارِ فانی

سفر درپیش ہے غافل تجھے اس دارِ فانی سے لگا دل کو نہ دنیا سے نہ عیش و کامرانی سے
چلے گا کام کب تک زور سے زر سے جوانی سے کنارہ ایک دن کرنا پڑے گا زندگانی سے

سرائے دہر میں مہماں فقط تو رات بھر کا ہے
کمر باندھے ہوئے تیار رہ عالم سفر کا ہے

یہ مانا ہم نے تجھکو عیش دنیا کا میسر ہے فراغِ دل ترقی سامنے ہے بخت یاور ہے
شرابِ بیخودی کا شوق ہے لبریز ساغر ہے نہ شرم آنکھوں میں دنیا کی نہ دل میں خوف محشر ہے

مگر واضح رہے تیری یہ بربادی کے ساماں ہیں
نظر آتے ہیں جو جلوے تجھے خواب پریشاں ہیں

چلے گا بزم میں جام شراب مشکبو کب تک رہیں گے زینت محفل تباں شعلہ رو کبتک
بڑھے گی دولتِ دنیائے دوں کی آرزو کبتک یہ تیری کر و فر کبتک رہے گی اور تو کبتک

کفن بردوش صیادِ اجل پھرتا ہے گلشن میں
نہ شاخِ گل پہ چوکے گا نہ چھوڑے گا نشیمن میں

کہاں ہیں وہ کہ جنکی ربع مسکوں پر حکومت تھی کہاں ہیں وہ خدائی کا جنہیں دعویٰ تھا نخوت تھی
کہاں ہیں وہ کہ جنکے پاس لاتعداد دولت تھی کہاں ہیں وہ زیادہ اہرمن سے جن میں طاقت تھی

کہاں نمرود ہے شداد ہے فرعونِ خود سر ہے
کہاں سہراب ہے رستم ہے دارا سکندر ہے

کہاں ہیں قم باذنی کہہ کے جو مردے جلاتے تھے کہاں ہیں جو مریض جاں بلب کا دم بچاتے تھے
ہوئے وہ کیا جو اپنے منہ سے کہکر دکھاتے تھے ہیں منہ میں موت کے سب جو مرنے سے بچاتے تھے

نہ اب وہ شمسؒ ہیں منصورؒ ہیں، عیسےٰؑ سلیماںؑ ہیں
دھری ہی رہ گئی حکمت فلاطوں ہیں نہ لقماں ہیں

حقیقت میں جگہ دنیا نہیں ہے دل لگانے کی
وفا کرتی نہیں یہ بے وفا سارے زمانے کی

نہیں ٹلتی مقرر ہے جو ساعت موت آنے کی
جگہ اس میں نہیں ہے دم مارنے کی لب ہلانے کی

نہیں خوف خزاں کب تک بہار زندگانی میں
کہاں تک شمع ہستی کی جلے گی بزم فانی میں

سمجھ سکتا ہے کون اس کو فنا کیا ہے بقا کیا ہے
کریں رد و قدح اس پر ہمارا حوصلہ کیا ہے

نہیں کچھ اختیار اپنا تو پھر چون و چرا کیا ہے
ہمیں اس بات سے کیا بحث ہے یہ ہو رہا کیا ہے

گل تر ہیں نہ بلبل ہیں نہ گلچیں ہیں گلستاں کے
فقط ہم تو تماشائی ہیں اس بازار امکاں کے

کھلی راہ عدم ہے ایک آتا ایک جاتا ہے
کہیں ہے نغمۂ شادی کہیں کہرام مچتا ہے

نیا ہر روز اس دار فنا کا رنگ ہوتا ہے
دو رنگی اس کو کہتے ہیں اسی کا نام دنیا ہے

زمیں گردش میں ہے یا گنبد گردوں کا چکر ہے
نیا جس وقت دیکھو سامنے آنکھوں کے منظر ہے

زن و فرزند ہیں اپنے نہ بھائی اپنا بھائی ہے
ہیں کہنے کو یہ سب رشتے نہ باپ اپنا نہ مائی ہے

یہ جیتے جی کی الفت ہے محبت ہے صفائی ہے
پس مردن کسی کی ہستی کب یہ کام آئی ہے

پرائی گور میں پیر اپنے پھیلاتا نہیں کوئی!
کسی کے ساتھ اس سنسار سے جاتا نہیں کوئی

غلط ہے دعوئے الفت سراسر عاشقی جھوٹی
ثبوت یک دلی جھوٹا دلیل دوستی جھوٹی

عزیزوں کی ہے تقریر خلوص باطنی جھوٹی
غرض جھوٹی ہے دنیا اور جھوٹی بھی بڑی جھوٹی

بھروسا اپنے دم کا ہی نہیں ہے غیر کا کیا ہو!
بچاتا ہے نہ کوئی وقت پر کیسا ہی اپنا ہو

وفا و مہر و الفت سب کہانی ہے فسانہ ہے
برائے نام اپنائیت ہے کہنے کو یگانہ ہے

ذرا دیکھو تو کچھ اس نفسی نفسی کا ٹھکانا ہے
پڑی ہے اپنی اپنی سب کو خود مطلب زمانہ ہے

امیدِ دستگیری بے نتیجہ ہے خیالی ہے!
کسی کا اس جہاں میں کوئی وارث ہے نہ والی ہے

دنیا کی بے ثباتی

آ رہی ہے آج یہ شہرِ خموشاں سے صدا
جس نے میرے دل کی جمعیت کو برہم کر دیا

طالبِ دنیا یہاں آ کر ہمارا حال دیکھ
ہم بھی تھے تیری طرح وارفتۂ بانگِ درا

آ ہمارے ساتھ میں اور دیدۂ عبرت سے دیکھ
دیکھ لے ہیں سب برابر اس جگہ شاہ و گدا

ہم بھی تھے تیری طرح ہر وقت محوِ جستجو!
جب مصیبت میں سدا رہتے تھے جویانِ ہما

ہم بھی زنجیرِ گنہ میں مثل تیرے بند تھے
زندگی میں یہ نہ ممکن تھا کہ ہم ہوتے رہا

موت نے دی سب کو اثم دائمی سے مخلصی
دیکھ پاداشِ عمل سب پاک دھندا کر دیا

غور سے دیکھا تو پایا ساری دنیا ہیچ ہے
اہلِ بینش کی نظر میں ہے جہاں عبرت کی جا

سن کے یہ آواز میرے دیدۂ باطن کھلے
ہو گیا معلوم مجھکو جو سمجھ سکتا نہ تھا

یاد مجھکو آ گئے گزرے ہوئے سارے عزیز
ان کی حالت سے مجھے اک وجد سا طاری ہوا

اپنی حالت کو لگا میں سوچنے جب غور سے
دیکھتا کیا ہوں کہ میری زندگی ہے پرخطا

لوگ کہتے ہیں مجھے تو اشرف المخلوق ہے
جھوٹ ہے میں سہو اور نسیان کا پتلا بنا

آ کے عالم میں ملایک سیرتی زائل ہوئی
دشمنِ انساں شیطاں سے مجھے پالا پڑا

ہر گھڑی پڑھتا ہوں اب تو جی ہی جی میں شعرِ ذیل
اور بہلاتا ہوں اس سے اپنے دل کو بارہا

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ!
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

عبرت

جمشید و کیقباد و سکندر کہاں ہیں آج
تاج و نگیں و رایت وافسر کہاں ہیں آج

قاروں سے بڑھ کے جو کل وہ تونگر کہاں ہیں آج
جو فرد تھے وہ مالکِ دفتر کہاں ہیں آج

آئی اجل تو آپ اکیلے چلے گئے
سب کچھ تھا گھر میں جمع مگر کچھ نہ لے گئے

اہلِ دول کا جاہ و حشم جاوداں نہیں
سکہ تھا جن کے نام کا ان کا نشاں نہیں

ڈنکہ نہیں علم نہیں تختِ رواں نہیں
قبروں پہ شامیانہ بجز آسماں نہیں

کسریٰ کا وہ جلال وہ سامان کیا ہوا
فرعون کیا ہوا ارے ہامان کیا ہوا

دنیا کا ابتدا سے یہی کارخانہ ہے
کل تھا کسی کا آج کسی کا زمانہ ہے

کوئی یہاں مقیم ہے کوئی روانہ ہے
قابض ہے کوئی اور کسی کا خزانہ ہے

آ ہوش میں ارے یہ زمانہ کا حال ہے
اور اس پہ تجھکو خواہشِ جاگیر و مال ہے

اکبر الہ آبادی

نخلِ حسرت وہ ہوں میں جسکو ہیں یکساں چار فصل
وہ شجر ہوں باغ عالم میں جو پھلتا ہی نہیں

وہ تمنا ہوں جو رہتی ہے ہمیشہ جی کے ساتھ
حوصلہ وہ ہوں جو دنیا میں نکلتا ہی نہیں

رنگ وہ ہوں جو زمانہ کے ہے باہر رنگ سے
وہ زمانہ ہوں جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں

شوق وہ ہوں وسعتِ دل جسکے آگے تنگ ہے
حرفِ مطلب وہ ہوں منہ سے جو نکلتا ہی نہیں

دل وہ ہوں جس میں چبھے ہیں خارِ حسرت سینکڑوں
خارِ حسرت وہ ہوں جو دل سے نکلتا ہی نہیں

نقد سودا وہ ہوں جو رائج نہیں بازار میں
سکۂ داغِ جنوں وہ ہوں کہ چلتا ہی نہیں

مولانا شبلی نعمانی

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھیگا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے !
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید خستہ جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائیگا یتیم ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں کب تک یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بے داد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تمکو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اسکا امتحاں کب تک

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونفشاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
مگر تم کو سنائیں دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اسطرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں !
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی　　چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کبتک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں　　تو پھر سمجھو کہ مرغان سحر کا آشیاں کبتک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کبتک

قومی فقیروں کی صدا

بے وقت حال تیرا بہتر ہوا تو پھر کیا　　عزت کا تیرے کیسہ پُر زر ہوا تو پھر کیا
مٹھی میں علم و فن کا گوہر ہوا تو پھر کیا　　قبضے میں صنعتوں کا دفتر ہوا تو پھر کیا
تو بی اے پاس کر کے نوکر ہوا تو پھر کیا

کعبے کے بیکسوں پر ہنستی ہے اب کنشتی　　سب ہے سوا خرابی سب سوا ہے زشتی
مرتے ہیں آج فلتے یہ جنتی بہشتی !　　جب پڑ گئی بھنور میں اسلامیوں کی کشتی
ہاتھوں میں ترے اس کا لنگر ہوا تو پھر کیا

تعلیم میں نہ رہنا ہرگز کسی سے گھٹ کر　　کر لاکھ لاکھ کوشش تو دوڑ کر جھپٹ کر
رکھ دیں گی غیر قومیں تختہ ترا الٹ کر　　غفلت میں رہ نہ جائیں عہدے تمام بٹ کر
ذلت اٹھا کے غافل لیڈر ہوا تو پھر کیا

ظالم نے اب نکالی یہ دشمنی کہاں کی !　　خواری کے گھاٹ آتارا کشتی نے آسماں کی
حیرت سے دیکھتے ہیں نیرنگیاں جہاں کی　　جب چھا گئی چمن پر اپنے گھٹا خزاں کی
ہر ایک زرد پتہ اختر ہوا تو پھر کیا

اس عیش ظاہری کو چھوڑ اے خدا کے بندے　　سامان ہو رہے ہیں تیری خرابیوں کے
اس کی مثال آ کر نادان ہم سے سن لے !　　رگ رگ میں چبھ رہے ہیں جب لاکھ لاکھ کانٹے
پھولوں کی سیج تیرا بستر ہوا تو پھر کیا

پردہ شکنی

ٹوک کر اک دن یہ میں نے بے حیائی سے کہا
کیوں ترا بازار دنیا بھر میں اتنا گرم ہے

ہنس کے وہ بولی سبب اس کا تو ظاہر ہے حضور
قوم میں باقی نہ اب عزت نہ باقی شرم ہے

ایک جنٹلمین اور اک ملا میں یوں گلچپ ہوئی
بولے جنٹلمین کیوں پردے میں کد حضرتکو ہے

کیا سبب ہے عورتیں پھرتی نہیں کیوں بے نقاب
چھوڑنا لازم ہر اک پر ہر بری عادت کو ہے

کیا دھرا ہے خاک پتھر کیجئے پردے میں بھلا
قید کرنا ہاں مگر منظور اک عورت کو ہے

چاہئے ٹھنڈی ہوا میں عورتیں دل شاد ہوں
جس کی حسرت آرزو ہر صاحب فطرت کو ہے

منہ دکھانے پر عبث ہے اعتراض معترض
یعنی اس پردے میں رکھئے دخل کیا صورت کو ہے

حفظ صحت کے لئے بھی ہے یہ پردہ ایک روگ
بیر اس سے اس لئے ہر مخزن حکمت کو ہے

اس پہ ملا بول اٹھا یہ آپ کی باتیں وہ ہیں
جس سے آتی شرم ہر ایک صاحب غیرت کو ہے

تم نے ہر ملکے اور ہر رسمے کو بھی تہ کر دیا!
کر لیا شاید گوارا اس لئے ذلت کو ہے

جن کی آنکھیں واقعاتِ دہر سے روشن ہوئیں
کر لیا اندازہ جس نے قوم کی حالت کو ہے

وہ نکالے گا نہ ہرگز اپنے منہ سے ایسی بات
عار جس کے ذکر سے ناموس کو عزت کو ہے

قوم بے پردہ کو دیکھو چشم عبرت بیں سے تم
پہنچی کس حالت سے اپنی آج کس نوبت کو ہے

منہ چھپانا ہے عبث یہ تو کہی بس ایک ہی
موقع اغوا اسی چہرے سے بدنیت کو ہے

تو فرضنا مان بھی لیں آپ کی خاطر سے ہم
پردۂ موجودہ اپنا کچھ مضر صحت کو ہے

لیکن اب اتنی گزارش آپ بھی تو مان لیں
یہ مضر صحت کو ہے تو وہ مضر عصمت کو ہے

آپ ہی انصاف سے یہ فیصلہ تو کیجئے!
دونوں میں ترجیح اس صورت میں کس صورت کو ہے

رباعی (پردہ شکنی)

کیا عذر قوم کو ہے ترقی کی بات میں!
رغبت کے ساتھ خود ہے وہ لیڈر کے ہاتھ میں

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلھن خوشی سے خود اپنی برات میں

دل

موج یا سیماب یا برق بلا رکھتا ہوں میں — کوئی سمجھا دے مجھے پہلو میں کیا رکھتا ہوں میں
داستاں میری نئی ہے سننے والوں کے لئے — سارے عالم سے نرالا ماجرا رکھتا ہوں میں
برق کا خندہ ہوں خس کا شعلہ پانی کا حباب — کیا بقا رکھتا ہوں میں نیرنگ فنا رکھتا ہوں میں
ہاتھ کھینچوں آرزو سے ہے یہ میری آرزو — ترک کر دوں مدعا یہ مدعا رکھتا ہوں میں
پیٹتی ہیں حسرتیں روتے ہیں ارماں زار زار — دل نہیں سینے میں اک ماتم سرا رکھتا ہوں میں
ذرہ ذرہ دیدۂ غولِ بیاباں ہے مجھے ! — آہ کہنے کو بغل میں رہ نما رکھتا ہوں میں
غیر کا شیدا ہے جسکو میں سمجھتا ہوں رفیق — آشنا بھی کس قدر نا آشنا رکھتا ہوں میں
ہاں یہی دل تھا کبھی آئینۂ تصویرِ یار — آج جسمیں نقش نقشِ ماسوا رکھتا ہوں میں
ہاں یہی دل ہے کہ شمعِ محفلِ امید تھا — دودِ آہِ یاس جس کی جا بجا رکھتا ہوں میں
تھا ابھی کل تک بساطِ ہر دو محفل در بغل — آج یہ دن ہے کہ ٹوٹا بوریا رکھتا ہوں میں
قلب ہے یہ قلب کا ہوتا نہیں ہرگز رواج — مس ہو جسکی ماہیت وہ کیمیا رکھتا ہوں میں
کفر کا ملجا ہے دل ایمان کا ماوا ہے دل — اک نشیمن میں بہم زاغ و ہما رکھتا ہوں میں
مایۂ اقبال بھی سرمایۂ ادبار بھی ! — دل نہیں رکھتا ہوں باہم دوسرا رکھتا ہوں میں
شکر کی جا ہے نہیں فیروز شکوہ کا مقام — درد رکھتا ہوں تو سر تا سر دوا رکھتا ہوں میں

در خورِ نفریں و اہل آفرینم ساختند!
آن چنانم ساختند و ایں چنینم ساختند

رباعی

حق ہے تو کہاں ہے پھر مجال باطل — حق ہے تو عبث ہے احتمالِ باطل
ناحق نہیں کوئی چیز راہِ حق میں — باطل کا خیال ہے خیالِ باطل !

فریادِ بلبل

آتا ہے یاد مجھکو گزرا ہوا زمانا وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانا
وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسمانکی وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا
پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وہ تالیاں بجانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلوں کی اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا
تڑپا رہی ہے مجھکو رہ رہ کے یاد گھر کی تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب دانا

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہی قفس میں میں غم سے مر جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں انکی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

جی چاہتا ہے میرا اُڑ کر چمن کو جاؤں آزاد ہو کے بیٹھوں اور سیر ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو اس طرح سے بسیرا اُس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے ساتھی جو ہیں پرانے اُنسے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو چمن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا وطن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد رہ کے جس نے دن اپنے ہوں گزارے — اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

بلبلِ اسیر

صیاد نے چھڑایا جس دن سے آشیانا — پہلو میں دل کے بدلے غم نے کیا ٹھکانا
گلزار سے نکالا قیدِ قفس میں ڈالا — بیدرد کچھ نہ سمجھا ظالم نے کچھ نہ جانا
آزاد تھا کبھی میں دلشاد تھا کبھی میں — کٹتے وہ بھی دن الٰہی تھا وہ بھی اک زمانا
روتا ہوں خون کے آنسو آتا ہے یاد جس دم — غنچوں کا مسکرانا پھولوں کا کھل کھلانا
موجِ صبا کا چلنا تھم تھم روش روش پر — شاخوں کا جھول جانا سبزے کا لہلہانا
وہ جانفزا ہوائیں وہ دلکشا گھٹائیں! — مرغانِ ہم نوا کا ساون کے گیت گانا
بارش کی وہ پھواریں برسات کی بہاریں — پتلی سی ٹہنیوں پر وہ جھولنا جھلانا
صحنِ چمن میں پھرنا وہ شب کو چاندنی میں — دل میں سرور آنا آنکھوں میں نور آنا
وہ شام کے نظارے جگنو وہ پیارے پیارے — وہ صبح کے ستارے ان کا وہ جھلملانا

اس قید بیکسی کا کب تھا خیال مجھ کو!
مل جائیں کاش واپس وہ ماہ و سال مجھ کو

ایام کے ستم کی کڑیاں اٹھا رہا ہوں! — بیداد سہہ رہا ہوں دکھ درد پا رہا ہوں
مجھ بے زباں کی بولی کوئی نہیں سمجھتا — ہر چند چیخ کر میں دکھڑا سنا رہا ہوں
قسمت کو رو رہا ہوں میں اور یہ ستمگر — جی میں سمجھ رہا ہے خوش ہو کے گا رہا ہوں

اِک آگ سی لگی ہے یادِ وطن کی دل میں — رو رو کے آنسوؤں سے اسکو بجھا رہا ہوں

سب ہم صفیر ہرے خوشیاں منا رہے ہیں
تن تن کے اُڑ رہے ہیں اُڑ اُڑ کے گا رہے ہیں

میرا نصیب مجھ سے گر کارساز ہوتا — میں بھی ترانہ سنجِ فصلِ بہار ہوتا!
پھولوں کی انجمن سے ہوتی اگر نہ دوری — یہ دل مرا نہ ہرگز یوں داغ دار ہوتا
شبنم کے وہ نظارے نظروں سے گر نہ چھپتے — کیوں زار زار روتا کیوں اشکبار رہتا
اس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے — میرا ابھی کچھ تو چاہا پر دردگار ہوتا
شاخِ نہال پر یا پنجرا مرا لٹکتا — پنجرے میں یا بجرم سرو و چنار رہتا

پنجرے کا آب و دانہ یارب ہے قہر مجھکو
کھانا عذاب جان ہے پینا ہے زہر مجھکو

اے کاش جاکے بیٹھوں پھر کنجِ دلنشیں میں — گاتا پھروں ترانے گلشن کی سرزمیں میں
سوزِ نہاں بجھاؤں جوئے چمن پہ جاکر — پھر جا ملوں میں اپنے یارانِ دانہ چیں میں
یہ تیلیاں قفس کی اے کاش پھونک ڈالوں — اتنا اثر تو یارب ہو آہِ آتشیں میں
اُجڑا ہوا نشیمن پھر جا بساؤں اپنا — اب کے جو تھا بنایا گلہائے یاسمن میں

کب ہو رہائی مجکو کب آشیاں میں پہنچوں!
اپنے وطن کو جاؤں اپنے مکاں کو پہنچوں!

غزل

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے — ہجومِ طائرانِ خوش نوا ہے
کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے — کبھی آہستہ رو موجِ صبا ہے
غبار و گرد سے جو اٹ گئی تھی — صبا نے غسل کا ساماں کیا ہے

ہوا نے کیا ہوا باندھی چمن میں!
کہ خوبانِ چمن کا سر ہلا ہے
چمن کا پتہ پتہ ہے نوا سنج
صبا کی آمد آمد جا بجا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک جھک گئی ہیں
زمیں پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے!
کِھلی ہر پنکھڑی گلہائے تر کی!
صبا نے کان میں کیا کہہ دیا ہے
بکھیری نسترن پر زلفِ سنبل
صبا شوخی میں فتنہ ہے بلا ہے
گیاہِ سبزہ کا طرہ پریشاں
صبا تیرے ہی چھیڑے سے ہوا ہے

نہیں ہے دعوےٰ مجھکو شاعری کا!
تو پھر مقطع سے بھی کیا مدعا ہے

مکالمہ

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہلِ مُلک کو!
گو کہ اُن کے نفع میں ہو ایک عالم کو ضرر
کارخانہ کا یہ راجس کے کبھی چاقو نہ لیں!
اُسکو ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انہیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر
سُن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہی طبع بشر
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاس قوم میں
اچھے اچھے راست باز و حق پسند و داد گر
ہاں بری اس عیب سے دیکھے اس دنیا میں ہے
چشمِ بد دُور اُمتِ مرحوم اے جانِ پدر
اور لوگوں سے انہیں لوگوں کا ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی قوم پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

اُجڑی ہوئی دُلہن

اے عروسِ مہ لقا او شاہدِ ماتم نشیں　آہ او رنگیں ادا او دلّی والی نازنیں
یاد ہے میکہ کہ تھی تیری جوانی جوش پر　چٹکیاں لیتی تھی ہر دل میں ادائے دلنشیں
ہائے وہ راتیں کہ تھی تو شمع بزمِ آرزو　تیرے گرد پروانے تھے ہم اے غیرتِ ماہ مبیں
ہائے وہ دن دل کو تھی جب حسرتِ ذوقِ خلش　نوکِ نشتر تھی رگِ جاں میں تری چینِ جبیں
جلوہ گر تھی ہر مُرقع میں تری تصویرِ حُسن　محفلِ ہستی تھی تو نقش و نگارِ دل نشیں
تا کمر لٹکی ہوئی وہ آہ جعدِ خم بہ خم　اُلجھی سُلجھی دوش پر بکھری وہ زلفِ عنبریں
آہ وہ عشوہ گری وہ گردشِ چشمِ سیاہ　ہائے وہ شرمیلی چتون وہ نگاہِ شرمگیں
قدِ موزوں پر چکن کے وہ دوپٹے کی پھبن　سرو پر پھیلی ہوئی تھی گویا شاخِ یاسمیں
اُبھرے سینہ پر وہ آغازِ جوانی کے نشاں　نازبو کے پھول اور وہ عِطرِ صندل کی زمیں
وہ تبسم ہائے شیریں وہ نوائے جاں نواز　وہ لبِ شکر شکن شکر فروش و شکریں
دوشِ نازک پر دوپٹے کا وہ آنچل سُرخ سُرخ　ہلکی ہلکی آہ وہ رُخ پر نقابِ ریشمیں
قد میں شوخی خد میں رعنائی بھری تھی کوٹ کر　آنکھ میں تھا زہرِ قاتل لب تھے قند و انگبیں
قیسِ آشفتہ تھی اک خلقِ خدا تیرے لئے　ہائے وہ راتیں کہ تھی تو لیلیٰ محفل نشیں
ہائے وہ طفلی کا عالم اور وہ جوشِ شباب　بھولی بھولی اُف وہ صورت وہ نگاہِ شرمگیں
آہ وہ بوٹا سا قد وہ ننھی ننھی انگلیاں!　آہ وہ تیرے لڑکپن کی ادائے نازنیں
ماں کی لوری جنبشِ موجِ تکلم تھی تجھے!　اور شمیمِ جاں فزائے خلد تھی خواب آفریں
پھول جھڑتے تھے لبِ رنگیں سے یوں وقتِ کلام　گل بداماں ہو چمن میں جیسے صبحِ یاسمیں
سر پہ طرۂ نظم کا تھا فرق پر تاجِ سخن　نطق کے پھولوں کا جھومر زیبِ آغوشِ جبیں!
آسمانِ ناز سے عالم فریبی کے لئے!　بن کے اتری تھی مگر تو حورِ فردوسِ بریں

تیرا سکہ تھا رواں اے شاہزادی چارسو — یاد آیا ہے کہ دِلّی تھی ترے زیرِ نگیں

لیکن اب تجھ میں کہاں وہ جلوۂ شانِ غیور — جھڑ گئے سب آہ تیرے تاجِ شہرت کے نگیں

چھا رہی ہے اب اُداسی آسمانِ حسن پر — اب نہ وہ تاروں کا جھرمٹ ہے نہ وہ ماہِ مبیں

تیری آنکھوں میں کہاں اب مستیٔ حسنِ شباب — تیرے شیشے میں کہاں اب وہ شرابِ آتشیں

اب کہاں وہ ذوقِ صہبائے سخن وہ بزمِ مے — اب کہاں وہ مجمعِ رندانِ مے خانہ نشیں

اب ہوا میں ہیں پریشاں تیرے پروانوں کی خاک — تیرے دیوانے ہیں اب شہرِ خموشاں کے مکیں

اب کہاں وہ اگلی سی کاشانہ افزائی کہ ہے — چشمِ حسرت حلقۂ در نقشِ عبرت شہ نشین

جن کے دامن میں پلی تھی آہ تو اے مہ لقا — اب وہ انجم خوابِ آسائش میں ہیں زیرِ زمیں

گوشِ عبرت میں مزارِ خفتگاں خاک سے — آ رہی ہے دھیمی دھیمی آہ فریادِ حزیں

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

استخوانِ بوسیدہ

کیا کہیں عالم میں ہم حیوان یا انسان تھے — خاک تھے کیا تھے غرض اک آن کے مہمان تھے

ایک دن اک استخواں پر جا پڑا میرا جو پاؤں — کیا کہوں اُس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے

پاؤں پڑتے ہی غرض اُس استخواں نے آہ کی — اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو صاحبِ جان تھے

دست و بازو سر و گردن شکم پشت و کمر! — دیکھنے کو آنکھ اور سننے کی خاطر کان تھے

ابرو بینی جبیں نقش و نگار و خال و خط — لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے

رات کو سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ — دن کی خاطر بیٹھنے کو طاق اور ایوان تھے

ایک ہی چکر اجل نے آن کر ایسا دیا — نہ تو ہم تھے اور نہ سارے عیش کے ساماں تھے

ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہم پر اے نظیر — او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انساں تھے

نماز پنجگانہ

اے نماز پنجگانہ کیا تری تاثیر ہے سالکوں کے واسطے تو نسخۂ اکسیر ہے
شاغلوں کے تو وقوتِ قلب کی تنویر ہے عارفوں کے واسطے الہام کی تدبیر ہے
پاک کر دیتی ہے دل وسواسِ شیطانی سے تو
صاف کر دیتی ہے دل افکارِ نفسانی سے تو

تو ہی نقشِ اولیں ہے تو ہی نقشِ آخریں دم قدم سے تیرے روشن ہے چراغ علم دیں
پاتے ہیں تیری بدولت صوفی گوشہ نشیں درجہ علم الیقیں حق الیقیں عین الیقیں
تو ہی مقصودِ حقیقی سے ملادے گی ہمیں
قرب حق کا راستہ تو ہی بتادے گی ہمیں

تو اٹھا دیتی ہے پردہ عالم ناسوت کا تو دکھا دیتی ہے جلوہ عالم لاہوت کا
تو بتا دیتی ہے رستہ عالم ملکوت کا تو جما دیتی ہے نقشہ عالم جبروت کا
بادۂ رنگِ شریعت تیرے میخانہ میں ہے
رادقِ رنگِ حقیقت تیرے پیمانہ میں ہے

سالکوں کو تو وسیلہ ہے فنا فی اللہ کا تو فقیروں کو عطا کرتی ہے رتبہ شاہ کا
صوفیوں کو تو ہے زینہ حق کی منزل گاہ کا عابدوں کا تو سہارا ہے خدا کی راہ کا
عارفوں کے واسطے اِک رہبر کامل ہے تو
قربِ حق کی منزلوں میں اولیں منزل ہے تو!

لاکھ میں کہدوں کلیدِ گلشنِ جنت ہے تو دین تو ایمان تو سرمایہ راحت ہی تو
خاص فرمانِ خدا ہے موجبِ رحمت ہے تو اور کیا لکھوں میں تجھکو فرض ہے سنّت ہی تو
اے نماز پنجگانہ بول بالا ہے ترا!
تو خدا کا نور ہے جگ میں اجالا ہے ترا

حشر میں تو کام آئے گی خدا کے سامنے | سُرخرو ہم کو کرے گی اولیا کے سامنے
آبرو اپنی رکھے گی انبیا کے سامنے | بخشوائے گی ہمیں تو اصفیا کے سامنے

دم قدم سے تیرے آساں ہو گی راہِ پل صراط
تو ہے عقبیٰ کے لئے سرمایۂ عیش و نشاط!

تو ہی قبلہ تو ہی کعبہ اور تو ہی عرفات ہے | دافع آلام ہے تو مبدأ برکات ہے
قاطع آفات ہے تو قاضی الحاجات ہے | محو جو تجھ میں ہو وہ گویا فنافی الذات ہے

ترا ہر ایک رکن رکھتا ہے جداگانہ ثواب
تو ہی اک ایسی عبادت ہے نہیں جسکا جواب

ہر مؤذن تیرے شمع حسن کا پروانہ ہے | جسکو کہتے ہیں اذاں ہم وہ ترا بیعانہ ہے
تیری جو تکبیر ہے وہ نعرۂ مستانہ ہے | ہر نمازی تیرا شیدا ہے ترا دیوانہ ہے

کھینچتی ہے دل عجب دل کش تری تکبیر ہے
دین و دنیا کے لئے تو نسخۂ تسخیر ہے

رباعیات

شیطاں نے کیا حضرتِ آدم کو نہ سجدہ | اور عذر کیا پیش کہ میں آگ وہ مٹی
حضرت کو بھی تقلید نمازی میں ہے یہ عذر | مسجد کا وہ مُلّا ہے میں صاحب کا ہوں منشی

اکبر الٰہ آبادی

ناتوانی سے قناعت پر ہوئے مجبور ہم | ضعف کے اسباب عزت کے نگہباں ہو گئے
صبر۔ خودداری۔ دلیری۔ حق پرستی اب کہاں | رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے

اکبر الٰہ آبادی

کیوں کج دِلا خیالِ فردا نہ کیا | بھولا جو بُرے وقت کو اچھا نہ کیا
پیدا کیا سب کچھ تو مگر آہ انیس | زادِ سفرِ مرگ مُہیا نہ کیا!

میر انیس

ہوائے کفر

ہیں ہوا پر کفر کے گیسو پریشاں اندنوں! / کوئے دل میں کیونکر آئے بوئے ایماں اندنوں

بڑھ رہا ہے کفر زلفِ علت و معلول سے / حُسن فطرت ہے حجاب روئے یزداں اندنوں

علم دیں مفقود ہے گم ہے صراط مستقیم / خضرِ رہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں اندنوں

کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں / بے زباں ہے بزم دل میں شمع ایماں اندنوں

صورت اِمروز میں گم ہے نگاہ ناتواں
نقش فردا چشم باطن سے ہے پنہاں اندنوں

ہوائے الحاد

(اکبر الٰہ آبادی)

ہوائے الحاد رنگِ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہی / جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے

ہمیں نے درس اِس ہوا پہ کھولا کیا چپ جو اُس سے بولا / ہمیں ہی خود اب تردد اسکا طبیعت اب ہاتھ مل رہی ہے

نہ عاقبت کا کسی کو ڈر ہی نہ عزتِ قوم پر نظر ہے / سروں میں سودا سما رہا ہی دلوں سے غیرت نکل رہی ہی

جو پیشوا خود ہوں رندِ مشرب تو کیا اچھے رنگ وعظِ مذہب / قلوب شیطان کے متبع ہیں زبان قرآں پہ چل رہی ہی

کرسچین باخبر ہیں ہر جا نہیں ہے چرچوں میں چرچا اسکا / ہمیں نے سمجھا ہی بہد اسکو اسی میں اب نسل پل رہی ہے

جو قوم ہمسایہ ہی ہماری نہیں ہے اس پر بلا یہ طاری / ہم اپنی مستی میں گھر رہے ہیں وہ ہوش میں ہے سنبھل رہی ہے

ہم اپنی صورت بگاڑتے ہیں بنا رہے ہیں وہ اپنے گھر کو / ہم اپنا نقشہ مٹا رہے ہیں وہ اپنے سانچے میں ڈھل رہی ہے

خدا کی ساعت ہیں یا کہ صدیاں چھپی نہیں ہیں ہماری بدیاں / بلائیں آئیں اور آ رہی ہیں کوئی گھڑی ہی کہ ٹل رہی ہے

زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے راز سوز حسرت
وہ شمع اسکو بیاں کریگی جو گورِ سید پہ جل رہی ہے

منافق ملّا

خدا سے منکر ہیں مولوی جی کہاں کا روزہ نماز کس کی / مٹا چکے ہیں خدا کی ہستی یہ دہریوں کے وکیل ہو کر

کسی کو انکارِ ابتدا ہے کسی کو اقرارِ ماسوا ہے / کسی کو نیچر نے ٹھگ لیا ہے حسین بنکر جمیل ہو کر

بہشت کیسی کہاں کا دوزخ یہ سب پرانے ڈھکوسلے ہیں / نہ کیوں یہ جدت طرازیاں ہوں فہیم ہو کر عقیل ہو کر

بلا کی موجوں میں پھنس گئی ہے امین اپنے عمل کی کشتی / کوئی نہیں جو مدد کو پہنچے سلامتی کا کفیل ہو کر

بے نمازی لیڈر

پڑھتے نہیں ہیں قوم کے لیڈر نماز کیوں / کھویا گیا ہے قوم سے یہ امتیاز کیوں

ہوتی نہیں ہے سجدہ فشاں صبح اور شام / درگاہ کبریا پہ جبینِ نیاز کیوں!

ارشادِ ایزدی سے یہ اغراض کس لئے / فرمودۂ رسول سے یوں احتراز کیوں

آقا سے کیوں غلام نے کی ہے یہ سرکشی / محمود سے ہوا ہے عناں تاب ایاز کیوں

ہم کو خبر سلف کی روایات سے نہیں / ناآشنا ہے شانہ سے زلفِ دراز کیوں

قرآں پہ جب عمل ہی مسلمانوں کا نہ ہو / ہو طاقت آزمائے حقیقت مجاز کیوں

سرسید آج زندہ جو ہوتے تو پوچھتے! / مشہور کر رہے ہو مجھے بے نماز کیوں

تم بے نماز ہو تو بلا سے ہوا کرو! / لیکن مجھے بتاتے ہو وجہ جواز کیوں

ساقی شرابِ غرب سرور آفریں نہیں / دیتا نہیں تو مجھکو مے خانہ ساز کیوں

اے مرغِ روح پنجۂ صیاد میں ہے تو / پھر تیرے بال و پر میں نہیں اہتزاز کیوں

اسلام کا ستارہ چمکنے کو ہے ظفر
گاتے نہیں ترانہ کوئی جاں نواز کیوں

نصیحت کا طریقہ

میرا قصور حضرتِ ناصح کریں معاف
اسلام یہ نہیں ہے کہ ماتھے پہ ہو شگاف
پھٹ جائے حلق سے جو اگر نکلے حرفِ قاف
اسلام کے یہ معنی ہیں نیت ہو اپنی صاف

تم کو خدا کا خوف ہو ایمان جان ہو
ہو پند کا خیال تو میٹھی زبان ہو

اس طرز سے ہو پند کہ ہو جائے کارگر
انساں کو وقتِ پند سمجھ لے نہ کوئی خر
یہ پند ہے کہ قینچی ہے یا تیغ یا تبر
باز آئے ایسے پند سے پھٹ جائے جس سے سر

دینی ہے گر کونین تو مصری لگا کے دو
ہو جائے فائدہ بھی پہ کڑوی زبان نہ ہو

واعظ و لیڈر کی بحث (اکبر الہ آبادی)

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
ہے تجھ کو ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج!
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الہٰ کا!
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حبِ جاہ کا!
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر
کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی
وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ہو نورِ رخِ مہر و ماہ کا

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ۔ کم سن مسوں سے ذکر ہو الفت کی چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنیں ۔ عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُک کے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسیں ۔ تُول مولوی یہ کام نہیں کچھ گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام ۔ پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھن بندھے ۔ سودا جناب کو بھی ہو ٹرکی کلاہ کا
ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب ۔ سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

معنی خیز

جو درد سے بیقرار ہے دل وہ اور اُس کو دُکھا رہے ہیں ۔ ستم تو دیکھو بجائے مرہم غضب کے چرکے لگا رہے ہیں
ہمیں سے کہتے ہیں سب یہ آکر کہ دل کو قابو میں اپنے رکھو ۔ کسی نے پوچھا نہ اُن سے جاکر وہ کیوں یہ فتنے اُٹھا رہے ہیں
غضب ہے دنیا خریدنے پر تلے ہیں یہ دیں فروشی کیسی ۔ جواہر دیں جو بے بہا تھے وہ کوڑیوں میں لٹا رہے ہیں
کہاں یہ قسمت کہ اک نظر بھی ملے جو موقع تو دیکھ لیں ہم ۔ سنا ہے ہم نے نقاب رخ سے وہ آج اپنا اٹھا رہے ہیں
جہاں میں ہیں اہل ملت جو اپنی ملت پہ مٹ رہے ہیں ۔ مگر ہمیں دیکھو ہاتھ سے خود بنائے ملت کو ڈھا رہے ہیں
نہیں ہے رحم انہیں نام کو بھی ہوئے ہیں سفاک کیوں یہ مائل ۔ فلک کے ہاتھوں جو مٹ چکے ہوں وہ اور انکو مٹا رہے ہیں
چلا نہ اغیار پر جو قابو تو اس طرف ظلم کی نظر کی ۔ وہ اپنے عاشق کو ڈانٹتے ہیں جلا رہے ہیں ستا رہے ہیں
ہمارے پہلو میں دل ہی آخر نہیں ہے پتھر کا کوئی ٹکڑا ۔ سنا کریں چپکے چپکے کیوں کر وہ سخت باتیں سنا رہے ہیں
حریص تجھکو ہے مبارک یہ تیرا ذلت کا لقمۂ تر ۔ یہاں تو عزت کی خشک روٹی خدا نے دی ہے وہ کھا رہے ہیں
یہ قسمت ہے باہمی مدد کا محل نہیں خانہ جنگیوں کا ۔ سمجھ لو اے مسلموں کہ دشمن تمہاری ہستی مٹا رہے ہیں
ہمیں کبھی جنکے تھا تاج سر پہ ہمیں تھے شاہان ہفت کشور ۔ ہم اپنی عظمت کو آپ کھو کر عذاب ذلت اٹھا رہے ہیں
زمانہ کی گردشوں کے یارب ہیں مسلموں پہ ہزار حملے ۔ مگر ابھی تک وہ تیرے رستے میں پاؤں اپنے جما رہے ہیں
امیر سب لپٹ کے تھے ساتھی مرے پہ کوئی نہ پاس پھٹکا ۔ اکیلے آئے تھے اس جہاں میں اور اب اکیلے ہی جا رہے ہیں

پھول کی فریاد

کیا خطا میری تھی ظالم تو نے کیوں توڑا مجھے — کیوں نہ میری عمر تک ہی شاخ پر چھوڑا مجھے
خون میرا اپنے سر لے کر تجھے کیا مل گیا — پیڑ کا لختِ جگر لے کر تجھے کیا مل گیا
حسن دلکش ہو کے میری جان کا دشمن ہوا — میرے رُخ کا رنگ خود میرے لئے رہزن ہوا
جانتا ہستی کے گر اس دردناک انجام کو — میں ہوا کے گدگدانے سے نہ ہنستا نام کو
شاخ نے آغوش میں کس لطف سے پالا مجھے — تو نے ملنے کے لئے بستر پہ لا ڈالا مجھے !
تیری خوشبو سے بسائیگا بچھونا رات بھر — صبح ہوگی تو مجھے تو پھینک دیگا خاک پر
پتیاں اُڑتی پھریں گی منتشر ہو جائیں گی ! — رفتہ رفتہ خاک میں ملجائیں گی کھو جائیں گی
تو نے میری جان لی دم بھر کی زینت کیلئے — کی جفا مجھ پر فقط تھوڑی سی فرحت کیلئے
دیکھ میرے رنگ کی حالت بدل جانے پہ ہے — پتی پتی ہو چلی بے آب مُرجھانے پہ ہے
پیڑ پانی مجھکو دیتا تھا زمیں سے کھینچ کر — وہ کہاں اور میں کہاں خاک اب مرے لب ہونگے تر
پیڑ کے وہ سبز پتے رنگ میرا ان میں لال — جس طرح سے ہو دوپٹے میں کسی گلرو کا گال
وہ شگفتہ رنگ میرا رنگ کی وہ آب و تاب — پھوٹ نکلے جیسے روئے صاف سے رنگِ شباب
تو نے میرے حسن کی دولت کو لوٹا یا نصیب — بے وطن ہوں مجھ سے غنچے میرا چھوٹا یا نصیب
پیڑ تھا مجھ سے نہال اب اس میں وہ خوبی کہاں — قد تو ہے چہرہ نہیں پھر شانِ محبوبی کہاں
جس کی رونق تھا میں بے رونق وہ ڈالی ہوگئی — حیف ہے بچے سے ماں کی گود خالی ہوگئی
پتیاں بے چین ہوں گی جب نہ مجھکو پائیں گی — غم سے بھونرے روئیں گے اور بلبلیں چلائینگی
دودھ شبنم نے پلایا تھا ملا وہ خاک میں — کیا خبر تھی یہ کہ ہے بے رحم گلچیں تاک میں
مہر کہتا ہے مری کرنوں کی سب محنت گئی — ماہ کو غم ہے کہ میری دی ہوئی رنگت گئی
اپنے پانی کے تلف ہونے سے بے خود ہے زمیں — اس قدر حیرت میں ڈوبی ہے کہ گویا دم نہیں

دیدۂ حیراں ہے کیا ہے باغباں کے دل پہ داغ — شاخ روتی ہے کہ ہے ہے گل ہوا میرا چراغ
میں بھی فانی تو بھی فانی سب ہیں فانی دہر میں — ایک قیامت ہے مگر مرگِ جوانی دہر میں
شوق کیا کہتے ہیں تو سن لے سمجھ لے جان لے — دل کسی کا توڑنا اچھا نہیں یہ جان لے !

صبحِ پیری

صبح پیری آکے اب شام جوانی جا چکی — ولولے سب مٹ گئے دل کی کلی مرجھا چکی
اب کہاں وہ راحت و تکلیف وہ دردِ دلا دوا — اب کہاں وہ شادمانی، غمِ لذت فزا
اب کہاں وہ وحشت و صحرا نوردی ہائے شوق — صورتِ ریگِ رواں وہ کوچہ گردی ہائے شوق
اب کہاں زیرِ سرِ شوریدہ وہ زانوئے یار — اب کہاں وہ دل کہاں وہ حسرتِ بوس و کنار
خواہشیں جتنی تھیں دل میں نذرِ حرماں ہو گئیں — حسرتوں کی بستیاں افسوس ویراں ہو گئیں
المدد اب بارِ عصیاں سے جھکا جاتا ہوں میں — سر خمیدہ ہے سیہ کاری سے شرماتا ہوں میں
وہ جوانی جس کے ہم برسوں رہے خدمت گزار — جبکی شمعِ حسن کے وارفتہ تھے پروانہ وار
وہ جوانی سوز سے جسکا نہ خالی ساز تھا — جبکی جاں پرور وفاداری پہ ہم کو ناز تھا
وہ جوانی آخرش داغِ جدائی دے گئی ! — دل سے ذوقِ آرزو ہائے محبت لے گئی
صبح پیری تو نہیں صد شکر ایسی بے وفا — مانتا ہوں نام کو تجھ میں نہیں مکر و ریا
اب تو آخر زندگی تک میرا تیرا ساتھ ہے — تیرا دامانِ وفا ہے اور میرا ہاتھ ہے

قبر میں بھی چین اور آرام سے سوئیں گے ہم
اور جوانی کے لئے ہرگز نہ پھر روئیں گے ہم

نامۂ یار

کیا لکھوں تجھکو کہ کیوں شاد ہوں کیا بات ہوئی — خط ملا تیرا شب قدر مجھے رات ہوئی

باعثِ شادیِ دل ہائے تری ذات ہوئی — تجھ سے اے جانِ جہاں نصف ملاقات ہوئی

تو نہیں جذبہ دل کی ترے تصویر تو ہے
حسنِ تقریر نہیں خوبیٔ تحریر تو ہے!

نامۂ شوق کو آنکھوں سے لگایا ہم نے — دلِ بیتاب کو پڑھ پڑھ کے سنایا ہم نے
رکھ دیا ہاتھ سے پھر اُس کو اٹھایا ہم نے — اِک نیا لطف ہر اک مرتبہ پایا ہم نے

اس کے پڑھنے سے سبھی رنج والم دُور ہوئے
اے خوشا بخت کہ مغموم سے مسرور ہوئے

اس کے دیدار سے میں ہو گیا فرحاں کیسا — آتشِ ہجر اب کہاں اب غمِ ہجراں کیسا
جوشِ وحشت ہے کہاں ذکرِ بیاباں کیسا — تارِ دامن ہے کہاں چاک گریباں کیسا

لب پہ آہ و فغاں نالہ و فریاد نہیں
طرز بھی گریہ وزاری کی مجھے یاد نہیں

تیرے اخلاص و محبت کے جو حال پڑھے — دلولے کیسے طرب خیز ہیں اب دل میں اٹھے
شکوۂ ظلم و ستم جور و جفا بھول گئے — دل سے ہم تیری عنایات کے ممنوں ہوئے

کر ستم ہم پہ تجھے ہم ستم ایجاد کہیں
تو زباں کاٹ لے گر ہم تجھے جلاد کہیں

تیری اُلفت کا صنم اتنا اثر رہتا ہے — دردِ دل آٹھ پہر دردِ جگر رہتا ہے
خوں فشاں صبح و مسا دیدۂ تر رہتا ہے — قصہ کوتاہ تو ہی پیش نظر رہتا ہے

آہیں کر کر کے جسے ہجر میں یوں یاد کریں
اس کی تحریر کو کس طرح سے برباد کریں

لب ہوا کرتے ہیں جب ہجر میں فریاد طلب — دل سوزاں کا ہوا کرتا ہے کچھ حال عجب
درد اٹھ اٹھ کے رگِ جان پہ ڈھاتا ہے غضب — میری تسکین کا ہوتا ہے یہی ہائے سبب

دل کا ٹکڑا ہے جگر کا مرے پارہ ہے یہ
تیرے نامہ کی طرف ہائے اشارہ ہے یہ

اس میں کیا شک ہے کہ کاغذ ہی کا ٹکڑا یہ ہے ۔ ایک تحریر نہیں سادا سا پرچہ یہ ہے
ہائے تجھ یار وفا کیش کا نامہ یہ ہے ۔ مجھ سے پوچھے کوئی کیا جانے کہ کیا کیا یہ ہے

زخم کو مرہم کافور کا پھاہا کہئے!
اس نے باسط کو جلایا ہے مسیحا کہئے!

عزم واستقلال (لالہ لال چند صاحب فلک)

آگ میں پڑ کر بھی سونے کی دمک جاتی نہیں ۔ کاٹ دینے سے بھی ہیرے کی چمک جاتی نہیں
سِل پہ گھس دینے سے بھی جاتی نہیں چندن کی بو ۔ پھول کی مٹی میں مل کر بھی مہک جاتی نہیں
ٹوٹ کر آتا نہیں کچھ لعل کی رنگت میں فرق ۔ توڑ دینے پر بھی موتی کی ڈلک جاتی نہیں
رنج میں آتا نہیں نیکوں کی پیشانی پہ بل ۔ دھوپ کی تیزی میں سبزہ کی لہک جاتی نہیں
جا نہیں سکتی کٹہروں میں بھی شیروں کی دھاڑ ۔ دستِ گلچیں میں بھی غنچوں کی چٹک جاتی نہیں
خوف وخطرے میں بدل سکتی نہیں مردوں کی خو ۔ عندلیبوں کی قفس میں بھی چہک جاتی نہیں
صاحبِ ہمت نہیں دبتا مخالف سے کبھی ۔ زور سے آندھی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں
نعرہ زن رہتا ہے آفات وحوادث میں دلیر ۔ بادلوں میں گھر کے بجلی کی کڑک جاتی نہیں

ملک کی الفت کا جذبہ دل سے مٹ سکتا نہیں
قوم کی خدمت کی خواہش اے فلک جاتی نہیں

شکوہ ہستی (جذبات ارشد)

میں نے نہ کچھ اٹھایا لطفِ بہارِ ہستی! ۔ آئی نہ راس مجھ کو لیل ونہارِ ہستی

ٹوٹا ہوا مرا دل وقفِ ہجوم غم ہے ! باایں ہمہ اسی پر ہے انحصار ہستی
میں تلخ کامیوں کا خمیازہ کش رہا ہوں بدلا نہ ایک دن بھی یہ روزگار ہستی
اک وہ ہیں پالیا ہے مقصد جنہوں نے اپنا اک وہ ہیں ذات جنکی ہے افتخار ہستی
اک وہ ہیں جو نہ سمجھے اب تک کہ کیا کریں ہم اک میں ہوں اس جہاں میں صد ننگ و عار ہستی
رنگِ فسردگی ہے نیرنگِ زندگانی ! اور کثرتِ الم ہے اک سازگار ہستی
ہے ابتدائے ہستی اک محشر تمنا ! محرومیٔ ابد ہے انجام کار ہستی
اندوہ و آرزو ہے اور حسرتوں کا عالم ہیں گلشن جہاں میں یہ برگ و بار ہستی
لیکن یہی تأثر ہے دائمی مؤثر ! ہے پائیدار نقش ناپائیدار ہستی
کیفیتِ تخیل ہے اجتماعی حالت پھر اس کے بعد ہونا ہے انتشار ہستی

مقصودِ آفرینش ہے سوزشِ محبّت
ہے برق عشق ارشدؔ ہر اک شرار ہستی

جذبات فقیر

دم بھر کا ہے تماشا لُبِ لباب ہستی دھوکا خیال کا ہے موجِ سراب ہستی
تفسیر ہے فنا کی بالکل کتاب ہستی باب عدم کی رہ ہے لاریب باب ہستی

ہستی کے آئینہ میں تفسیر نیستی ہے !
یہ خواب ہے وہ جس کی تعبیر نیستی ہے

عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا آپ جو ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا
بر میں جب دلبر نہ ہو تو کیسے دل بر میں رہے جب نہ ہو آرام دل تو پائے دل آرام کیا

ہیں جو بسمل شیفتہ گیسوئے روئے یار کے
وہ سمجھتے ہی نہیں ہیں کفر کیا اسلام کیا

اطوارِ اہلِ دُنیا (حالی)

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر!

دوست اِس کے ہیں نہ اُس کے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم!
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیرِ نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رُسوا اُسے دل کھول کر!

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے خواہاں ہیں اُس سے عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے لاکھ احساں ہم پہ گر

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو!
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے پھر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر

سخن سازی

ہے مردِ سخن گو بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو

موجود سخن گو ہو جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پھر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونوں

تعلیم پیر خرابات

تھا دل میں صلاح وخیر کا جوش   بر ہم عقلا سے ہو کے رُوپوش
نکلا ورخانقاہ سے خاموش   کردم گزرے بہ میکدہ دوش
سبحہ بکف و سجادہ بر دوش

پڑھ کر وہاں اِک حدیث مشکوٰۃ   دکھلائے ثواب زہد وطاعات
سنکر مری لاف اور طامات   پیرے بدر آمد از خرابات
سرمست زجام عشق و مدہوش

میں نے کہا السلام طنزاً   کیں اونچی نگاہیں اس نے فوراً
دیکھا مجھے اور ہلا کے گردن!   گفت از سر وقتِ خویش بامن
ایں جا نخرند زرق مفروش

بالکل نہیں کام اُدھار کا یاں   یاں کوئی نہیں اِرم کا خواہاں
آنقد معاملہ کر اے جاں   سبحہ بدہ وپیالہ بستاں!
خرقہ بنہ وپلاس درپوش

ضائع کیا تو نے وقت کافی!   مافات کی فرض ہے تلافی!
کھوتا ہے عبث تو عمر باقی   درصومعہ بےہودہ چہ باشی
درمیکدہ رَوشراب مے نوش

پھر بھی رہے جو ہوش باقی   ممکن ہے یہ امر اتفاقی
ساقی سے کر آنکھ کو ملاقی   بینی چو عیاں جمال ساقی
جان و دل و دیں کنی فراموش

شیخی چلتی ہے یاں نہ پیری   دیتی ہے نہ کام کچھ امیری!
ہے زہر یہ نفس کی اسیری   چوں ترک مرادِ خویش گیری
گیری ہمہ آرزو در آغوش

خاموش خدمت

(از جناب نواب اعزاز الدین احمد صاحب بہادر فرمانفرمائے ریاست لوہارو)

مے خانے شوقِ بادہ میں اک روز میں گیا
کنڈی بھی بند پیرِ مغاں کی خبر نہ تھی

پایا نہ جب کسی کو تو مجبور یاس سے
پھرتا تھا اُلٹا اِتنے میں آواز سی سُنی

دروازے سے جو کان لگایا تو کیا سُنا
ساغر سے تھی صراحی یہ غصے میں کہہ رہی

مے مجھ سے لے کے لیتا ہے ساقی کے بوسے تو
نعمت نہ آج تک جو میسّر مجھے ہوئی

کیا تجھ میں ایسی بات ہے کیا ہے وہ امتیاز
عزت جو بزمِ یار میں ایسی تجھے ملی

نقش و نگار میں نہیں کچھ مجھ سے تو سوا
شیشے کا تو اگر ہے تو میں ہوں بلور کی

پیتی ہوں گھونٹ خون کے یہ روز دیکھ کر
کھاتی ہوں طیش دَور کی آتی ہے جب گھڑی

چھوڑوں گی تجھکو توڑ کے پھوڑوں گی اپنا سر
معقول وجہ اس کی بیاں تونے گر نہ کی

پہلے تو چپکا سنتا رہا جام یہ کلام !
پھر بولا اے بہن مجھے اس کی خبر نہ تھی

تو یوں کرے گی ردّ و قدح اور بے سبب
سُن مجھ سے تاکہ تجھکو بھی ہو جائے آگہی

کچھ راز یہ نہیں ہے اگر جانتی اسے
مجھکو یقیں ہے کہ بگڑتی نہ تو کبھی !

مے پیرِ میکدہ کی ہے تیری کہاں سے ہے
مالک جو پھر بھی تو بنے اچھا یہی سہی

تل تل مگر شراب کے دینے میں کرکے تو
احسان مے کشوں پہ جتاتی سدا رہی

مجھ کو تو دیکھ رہتا ہوں چکر میں در خموش
ساقی کو کیوں نہ بھائے مری ایسی چاکری

ملتے لبوں کے بوسے ہیں اس واسطے مجھے
جس آرزو میں ہوگی تری ختم زندگی

ساقی کو دیکھ لیتی ہے بے پردہ بزم میں
یہ بھی نصیب کی ہے بڑی تیرے یاوری

اعظم یہ سن کے میں نے کہا دل میں سچ ہی یہ
احسان جو جتائے نہیں ہے وہ آدمی

سمندرِ عشق

(جناب مولوی ضامن علی صاحب دہلوی)

پس بیا بیا اے مرا نگہباں، تو نوح کشتی را پشتی باں   بر عین عجلت رساں بہ جاناں، رساں جاناں۔ رساں بجاناں
اب چلو سکھی اُس کنتھ پاس جو ہے پی، پل ملکا نا   سات سمندر پار بسے جی، آسی دیس موہے جانا
چلونا میرا صابر پیارا جی   ملونا میرا مظہر پیارا جی
در عشقِ صنم۔ بیتاب منم' معلوم نشد کاں یار کجا   پے برد کسے یا مرد کسے یا گفت فقط ایں چون و چرا
سُن بات مری اب اے ری سکھی، وہ کنتھ بسے کس دیس جا   جیا ترسے پیا دیکھن کو، کوئی ایسا نہیں دے پی کو ملا
چلونا میرا صابر پیارا جی   ملونا میرا مظہر پیارا جی
نے خواب مرا، نے صبر بجاں، در ہجر صنم چوں برق تپاں   یا جاں برود یا آں برسد، من جاں بلبم، گرچہ کرچناں
نینن میں میرے نیند نہیں، دل کو تو سکھی اب چین نہیں   بن دیکھے سکھی کیسے یہ بنی، پیا ڈھونڈت ہوں ملتا ہی نہیں
کپڑے بھی پھٹے جوگن بھی بنی، بدنام ہوئی سیاں کے لئے   یا تو ملے ہمسے وہ سجن، گذریگی نہیں بن جی کے دیئے
یا تو بنی لیلوں ہاتھ، پھر ونگی   میں تو رام دیوانی جی
دریائے عمیق۔ امواج بپا، کشتی کہن، تاریک شبے   ملاح خفا' بر جان بلا' اے شیر خدا اللہ مدد دے
پہلے ہی سمندر ڈول رہی ہے' ناؤ مری دو پار لگا   اے شیر خدا' اب کوئی نہیں' فریاد سنے ضامن کی آ
میری اِدھر میں ڈولے ناؤ   سیاں میری خبر نہ لینی جی
از غرق امن کردی تو مرا، از جوشِ بحر طوفان بلا   اے یارِ خدا' امید برآ، تا وصل شود جاناں مرا
ڈوبت ڈوبت پار لگا، دوجا سمندر اور رہا   اب پار لنگھا اُس سے مجھے، اے بحرِ کرم دریائے عطا
میری ادھر میں ڈولے ناؤ   سیاں میری خبر نہ لینی جی
خود مالکِ ملکِ فنا و بقا، اے شیر برائے شیر خدا   اعجاز شما مشکل بکشا، از بحر سوم امداد و رہا
مجھ کچھ نے مجھکو گھیر لیا، کس سے میں کہوں جی تیرے سوا   حیرت نے حیران کیا، گھیرا ہے رہا جلدی سے آ
سنو نا میرا ہادی پیارا جی   کردنا مجھ سے کنارا جی

من چارنچار اے چارہ گرم، نگراں تو اے خضر کرم	دریائے چہارم چار طرف، امواج ستم، گرداب بہم
لو آکے خبر جلدی سو مری، اے شاہ نجف مولائے علی	حسنین کا صدقہ لیجو بچا، اے دل و جانانِ نبی
علی جی نے میری جان بچائی جی	علی جی نے میری پیت نباہی جی

پنجم و ششم دریائے فنا، مکنوں گہر در آب بقا	غواص بسے، بگرفت گہر، یا الیس لہٗ الا انا
وہ چھوڑ گئی نیا کو مری، دریائے فنا میں دو بت سبھی	بن تیری مدد یا صابر علی، ہوں یار کہاں قطب یا ولی
دریائے فنا میں ہو کے فنا، ڈبکی جو لگی اک سیپ ملا	موتی بھی ملا انمول کھرا، سنگار بنا مجھ برہن کا
اجی میرے جاگے ہیں بھاگ	سیاں کے میں شگن مناتی جی

ایں ہفت طبق در ذات یکے، در موج دگر اوصاف خدا	ارباب فنا، اصحاب بقاء اظہار کند اسرار خدا!
اُس پار بسے ایک شاہ مرا میں راج دلاری دو کھڑی	ملنے کی ہوئی جب دل میں ہوس کچھ بن نہ پڑی دریا میں گری
ڈوبت ڈوبت بھور بھئی، اے عشق مجھے دے پار لنگھا	جب پار لگی وہ یار ملا، سب ہوں کا شاہ سہاگ بھرا
سب بھول گئی پہلی بپتا جب یار نے پی چھیتن سو لگا	تن ایک بھیا، من ایک بھیا، کوئی تو دو دوئی کو بتا
اجی میرے جاگے ہیں بھاگ	سیاں کے میں تو شگن مناتی جی

تضمین بر قطعہ حضرت نظامی گنجوی

(از جناب کنور تنبیر پرشاد اختر)

دیکھتے دیکھتے ہنگامۂ وحشت کی نمود	ہو گئے صبر و سکوں ضبط و تحمل مفقود
نہ رہا بس میں جو میرا دلِ حسرت آلود	دوش رفتم بخرابات مرا راہ نہ بود
میزدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

یا انہیں بادہ کشی سو نہ تھی فرصت زنہار	یا وہ آنے سے مرے دل میں ہوئے کچھ بیزار
یا سبھی تھے مے گلرنگ سو مست و سرشار	یا نہ بد ہیچکس از بادہ پرستان بیدار
یا چو من مست بد ند ہیچ کس ہشیار نبود

میں پکارا ہی کیا دیر تک ان کے در پر　　سنکر آواز مگر کوئی نہ آیا باہر
رات سنسان تھی اک عالم ہو تھا اکثر　　نصف بگذشت ز شب بیشتر و یا کمتر
رندے از غرفہ برآورد سر و رخ بنمود

اور کہا کون ہے تو پوچھ رہا ہے کس کو　　اسقدر رات گئی کس لئے آیا کہہ تو
مجھ سے تو صاف بیاں کر ترا جو مطلب ہو　　گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگو
کس دریں نیم شب از بہر کس ایں در نکشود

نہ یہاں انجمن علم نہ یاں مجلس پند　　نہ یہ بت خانہ کہ ہو سیر سے اس کی خورسند
نہ یہ کعبہ کہ طواف اسکا کرے تو دم چند　　ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ بدیر آئی و اندر صف پیش آیستی زود

اپنے ہی حال میں ہم رہتے ہیں مست و خورسند　　نار دوزخ سے حذر ہمکو نہ فردوس پسند
کفر سے کام نہ اسلام کا کوئی پابند　　ایں ہمہ دیر مغانست دریں مستانند
ساقی و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ہے غرض روز ازل سے یہاں کیا کیا حاضر　　مطرب و چنگ و رباب و خم صہبا حاضر
نغمہ روح فزا جلوۂ زیبا حاضر　　انچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر
کافر و ارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود

توبہ کر توبہ سے پیمانۂ مے تو بھی پی !　　ترک کر مذہب و ملت کے یہ جھگڑے جلدی
اپنے مسلک کو بنا صلح کل اور چھوڑ خودی　　گر تو خواہی کہ دم از صحبت اینہا بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

تجھکو گر سوز سے کچھ ساز ہے اور ساز سے سوز　　دیدۂ دل میں رہے حسن صنم جلوہ فروز
ورنہ ہے منزل مقصود بہت دور ہنوز　　اے نظامی چہ زنی حلقہ بایں در شب و روز
کہ ازیں آتش سوزاں تو نیابی جز دود

میں کیا ہوں؟

میں تم سے کیا بتاؤں اے اہلِ دل میں کیا ہوں — اِک نقطۂ محبت یا مرکزِ وفا ہوں!
سب چھیڑتے ہیں مجھکو خاموش ہوں مگر میں — ہوں نغمہ ہائے پنہاں یا سازِ بے صدا ہوں
ہوں اعتبارِ ہستی . اندازہ گیرِ مستی ! — مخمور اک شرابی مغرور اک گدا ہوں
مدت ہوئی کہ میں ہوں دلدادۂ مشائخ ! — یا فرشِ خانقاہ ہوں یا نقشِ بوریا ہوں
سجدے کئے ہیں میں نے برسوں صنم کدہ کے — دل سے بتوں کا بندہ ظاہر میں باخدا ہوں
ہے ظرف میرا عالی مستغنیٔ تمول — گنجینۂ سلاطیں یا خوانِ اغنیا ہوں
مانندِ کاہ مجھ تک کھنچتے ہیں دل سبھوں کے — ہوں مادۂ کشش کا جذابِ کہربا ہوں
محفل میں اہلِ دل کے ہوں نغمۂ طرب زا — مجلس میں اہلِ غم کی میں درد آشنا ہوں
کرتا ہوں باخبر میں منزل سے بے خودوں کو — اس قافلہ میں گویا آوازۂ درا ہوں!
سرسبز ہوں بظاہر باطن میں خون ہے دل — میں اس چمن میں گویا نیرنگیٔ حنا ہوں
ہر نسخۂ محبت میں نے کیا مرتب ! — اکسیرِ اہلِ دل ہوں. اک جزوِ کیمیا ہوں
گر مشتِ خاک ہوں میں سب کی نگہ میں لیکن — اک مخزنِ جواہر یا معدنِ طلا ہوں
اک بیوفا پہ مائل مدت سے ہے مرا دل — پیہم ترانہ سنجِ روحی لک الفدا ہوں
یہ انتقال پیکر ہے صورتِ تغیر — ہیں ورنہ درحقیقت سرمایہ بقا ہوں
ہوں قلزمِ قلم کا مشہور اک شناور — گو دجلۂ جہاں میں اک موجِ فنا ہوں
اجزا لئے دل سے میرے خلقت ہوئی بتوں کی — کہتا ہے پھر مجھ ہی سے ہر شوخ میں خدا ہوں
تھا پتھروں سے مجھ کو شغلِ صنم تراشی — دیوانگی میں بھی میں بے کار کب رہا ہوں
بالاختصار سن لو یہ سرگزشت میری — اٹھتا ہے جو دلوں میں وہ دردِ جانگزا ہوں
رگ رگ میں ایک نشتر ٹوٹا ہوا پڑا ہے — جتنی مصیبتیں ہیں ان سب میں انتہا ہوں
اس کی نظر ہے سطحی میری نظر ہے غائر — ناصح کی دوستی کو کس طرح میں نباہوں

کہو تو سہی

یکایک آئے کہاں سے بھلا کہو تو سہی ۔ یہ کیوں اتر گیا منہ چاند سا کہو تو سہی
ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی ۔ یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوئے اے مہ لقا کہو تو سہی

جبیں سے نور وہ کیا ہو گیا کہو تو سہی ۔ ضیائے رخ نے کدھر رُخ کیا کہو تو سہی
مری طرح ہو کہیں مبتلا کہو تو سہی! ۔ یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوئے اے مہ لقا کہو تو سہی

بیان ہم سے کرو کون سا تمہیں غم ہے ۔ یہ بے سبب نہیں اصلا مزاج برہم ہے
ہوا ہے کچھ نہ کچھ ایسا کہ فکر ہر دم ہے ۔ یہ کیا سبب ہے کہ لب خشک چشم پرنم ہے
کرو حجاب نہ بہرِ خدا کہو تو سہی

ہمیں کو رنج دمِ قیل و قال دیتے ہو ۔ رقیب کو نہیں ایسا ملال دیتے ہو
جواب غیر کا قبل از سوال دیتے ہو ۔ ہماری بات کو سن سن کے ٹال دیتے ہو
مزا ہے دل کے جلانے میں کہو تو سہی

ہزاروں گزرے ہیں لیلے جمال قیس مزاج ۔ ہمیشہ ہوتے ہیں عاشق گدا و صاحب تاج
نہ قحطِ جنسِ محبت تھا اسطرح جو ہے آج ۔ ہوا وفا کے عوض بیوفائیوں کا رواج
یہ کیوں زمانہ کی بدلی ہوا کہو تو سہی

بہار کا بھی نہیں ہے مدام نظم و نسق ۔ خزاں نے دفترِ گل کے الٹ دیئے ہیں ورق
خوشی کے واسطے ہے اکث ایک روز قلق ۔ غرور حسنِ دو روزہ پہ ہے تمہیں ناحق
شباب کس کا رہا ہے سدا کہو تو سہی

سراسری ہے یہ تقریر اُن کی شائستہ ۔ کبھی ملے تو کہا کان میں یہ آہستہ

مزاج کیسا ہے کیا ہو کسی سے وابستہ　　اسیر زلف سے وہ پوچھتے ہیں دانستہ
اس انتشار کا کچھ ماجرا کہو تو سہی

بیان ہو نہیں سکتا کچھ اُس کی شوخی کا !　　جواب ہی نہیں دیتا سوال کا سیدھا
سڑی بنا دیا مجکو یہ واقعہ ہے نیا　　ہوا میں سائلِ بوسہ تو ہنسکے کہنے لگا
مزاج کیسا ہے بہرِ خدا کہو تو سہی

خیالِ کاکلِ شبگوں جو ہے دل و جاں سے　　سیاہ خانہ مجھے کم نہیں ہے زنداں سے
خبر ہے سر بسر اُن کو بھی قلب نالاں سے　　وہ جان بوجھ کے کہتے ہیں مجھ پریشاں سے
کمندِ زلف میں کیسا دل پھنسا کہو تو سہی

عیاں ہے رُخ پہ مرے دل جو رنج سہتا ہے　　جگر کا خون سدا آنسوؤں سے بہتا ہے
کہیں چھپانے سے پوشیدہ عشق رہتا ہے　　جو دیکھتا ہے مرا حال زار کہتا ہے
فسانۂ دلِ غمگیں ذرا کہو تو سہی !

نہ وہ مزاج نہ وہ چہچہے نہ وہ ہنسیاں !　　اداس رہنے کا باعث ہے کیا کہو تو سہی
جواب کچھ مری باتوں کا دو خموش نہ ہو　　زباں سے اپنی برا یا بھلا کہو تو سہی

انتظار

کتنا ہی دل کو تھامتی ہوں شب سے بار بار　　تھمتا ہے دل تو اشک نکلتے ہیں بے شمار
گنتی ہوں اضطراب میں تاروں کو بار بار　　گھڑیال کی صدا کا ہے کانوں کو انتظار
یہ نا امیدیاں یہ طبیعت کو انتشار !　　یہ عالمِ سکوت کہ جیسے گناہ گار
ڈرتا ہے جی جو گھر کی طرف دیکھتی ہوں میں
اندھیر ہے جدھر کی طرف دیکھتی ہوں میں

نیرنگیٔ ہستی

از جناب اکبر الٰہ آبادی مرحوم

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابیٔ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں

کہیں تمکینِ خوبی ہوں کہیں ہنگامۂ الفت
کہیں رنگِ رخِ گل ہوں کہیں شورِ عنادل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہدِ معنی
کہیں ہوں محملِ لیلےٰ کہیں لیلائے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبورِ مطلق ہوں کہیں مختارِ کامل ہوں

کہیں ہوں شوقِ آزادی کہیں تدبیرِ پابندی
کہیں میں جوشِ سودا ہوں کہیں طوقِ سلاسل ہوں

کہیں عمرِ دوروزہ ہوں کہیں ہوں آرزو دل کی
کہیں گھٹنے کے لائق ہوں کہیں بڑھنے کے قابل ہوں

کہیں جذبِ محبت ہوں کہیں دردِ دلِ عاشق
کہیں دل مجھ میں داخل ہے کہیں میں دل میں داخل ہوں

کہیں جوش اہلِ معنی کا کہیں ہوش اہلِ صورت کا
کہیں شورِ انا الحق ہوں کہیں دعوائے باطل ہوں

کہیں ہوں حسن کا ایما کہیں ہوں درد کی لذت
کہیں قاتل کی چتون ہوں کہیں چتون کا بسمل ہوں

کہیں ہوں صورتِ لیلےٰ کہیں حالِ دلِ مجنوں !
کہیں چھپنے کے لائق ہوں کہیں کھلنے کے قابل ہوں

کہیں یاروں کی محفل میں کہیں ہنگامۂ دل میں
کہیں میں رندِ مشرب ہوں کہیں درویشِ کامل ہوں

کہیں تصویرِ حیرت ہوں کہیں محوِ پریشانی !
کہیں ہوں شیفتہ رخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں

معاون ہوں کسی جا میں کہیں امداد کا طالب
کہیں خضرِ ہدایت ہوں کہیں گم کردہ منزل ہوں

کہیں ہوں گوہرِ مقصد کہیں دامن تمنا کا
کہیں ہمت کریموں کی کہیں امیدِ سائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

یہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبر
مگر ساکت ہوں جبتک آپ میں آنے کے قابل ہوں

دل اور محشر (قطعہ) (لکھنوی)

کہا اک دن دلِ بسمل سے میں نے دردِ فرقت میں
اگر ہے صبر کا دعویٰ تو مشغولِ فغاں کیوں ہو

کہاں تک زور شورِ نالۂ محشر طراز آخر
جفائے نازِ دلبر سے لبوں پر الاماں کیوں ہو

یہ بیتابی برنگِ ماہیٔ بے آب کیا معنی !
مثالِ شعلہ و سیماب مضطر اور تپاں کیوں ہو

تلاشِ پنبہ و مرہم برائے زخم کیا حاصل
کسی پر زورِ دست و بازوئے قاتل عیاں کیوں ہو

سرِ شوریدہ کو خلوت میں سنگِ یاس ممکن تھا
ہجومِ عام کیوں ہو اُن کا سنگِ آستاں کیوں ہو

پئے اظہارِ حالت مشقِ جذب اچھا طریقہ ہے
فغانِ نیم شب مثلِ خروشِ پاسباں کیوں ہو

خموشی چاہئے ہمدرد اگر معدوم ہو جائے
تمناؤں کے سر پر منتِ احسانِ زباں کیوں ہو

وفورِ عشق میں ہے اضطراب اک عالمِ دیگر
یہ عالم باعثِ آبادیٔ ناواقفاں کیوں ہو

خوشا وہ دن تقاضائے ستم پر جبکہ مرتا تھا
کھلا اب ہاتھ قاتل کا تو شورِ الاماں کیوں ہو

وہ دن بھی یاد ہے بیٹھا تھا جب دیرِ برہمن میں
اٹھائے جلنے پر اب شکوۂ جورِ بتاں کیوں ہو

وہ بزمِ حضرتِ واعظ سے نفرت کیا ہوئی آخر
خدا کے گھر میں صبح و شام جا کر میہماں کیوں ہو

شباب یار کے آنے کی کیا کیا منتیں مانیں
وہ وقت آیا تو پھر اک اک ادا پر پشیماں کیوں ہو

بڑی مشکل سے کی تھی آبیاری باغِ الفت میں
اسے یہ زندگی بھر کی ریاضت رائگاں کیوں ہو

رموزِ مصلحت انگیز کو سمجھا نہ اس دھن میں
بیانِ عاشق و معشوق پر پردہ درمیاں کیوں ہو

وہ ساعت یاد ہے ہنستا تھا جب میری یہ کہنے پر
اگر ہو قدرِ الفت عاشقِ ناقدرداں کیوں ہو

کہا اس نے یہ چند اشعار سن کر سچ ہے اے محشر
مگر بے کار اب طعنِ زبانِ دوستاں کیوں ہو

برنگِ ابر و شبنم سوزشِ باطن سے میں رو دوں
مثالِ برق و گلِ خنداں یہ دورِ آسماں کیوں ہو

تجھ ایسے دوست نے جب رکھ دیا الزامِ بے صبری
تو پھر اس شعرِ غالب میں مری ساکت زباں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

حالی

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلّف علامت ہے بیگانگی کی!
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتسابِ شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ!

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ!

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا ایک اِک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ثابت ہو خِسّت زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا!
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ

ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر
نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھریت زیادہ

قطعہ (جناب ذوق دہلوی)

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اُکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہوا پیوست

گزرتی ہوگی بہ آرام زندگی تیری
کہ تجھکو اب نہ غم نیست ہی نہ شادی ہست

کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات میں انساں
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست

اٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ بافراغ کرے کنجِ عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کے
تو سلسلہ میں فقیری کے پھر ہوا پابست

رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست

گر ایک عمر میں پہنچا مقام اعلےٰ پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست

جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اس کو
تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالادست

ہمیشہ جنگ رہی بعد صلحِ کل کے بھی
کہ نفس دشمنِ سرکش ہے اس کو دیجے شکست

جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہی مست

نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہ زہ بہ با خدا گرفتار است

جان ہی تو جہان ہی

صرفہ اب پردہ دری میں دلِ ناداں کس کا
دامنِ یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا

ہوسِ چاک گریباں ہے جو صبح شبِ وصل
چھٹ گیا ہاتھ سے مشتاق کے داماں کس کا

وصل کا لطف کہاں جبکہ ہوا اپنا وصال
آپ میں جب نہ رہے تو غمِ ہجراں کس کا

ہلال عید

(از جناب مولوی وہاج الدین حیدر صاحب (علیگ) بیرسٹرایٹ لا گورنمنٹ بھوپال)

اے مہ عید تجھکو کیا کہئے
ابروئے یار مہ لقا کہئے

یار ہے بے وفا تو تجھکو بھی
خنجرِ یار بے وفا کہئے

عقدۂ وصل اگر کھلا تو تجھے
ناخن اُس رشکِ ماہ کا کہئے

نہ ملے عید وہ تو پھر تجھکو
نیشِ عقرب سے بھی سوا کہئے

نہ ستائے بلانصیبوں کو!
عید کے چاند سے ذرا کہئے

بام پر وُہ ہیں چرخ پر مہ عید
کس کو دیکھے کوئی بھلا کہئے

عید وہ مِل رہے ہیں غیروں سے
ہم سے کہتے ہیں مُدعا کہئے

تعلیم نسواں

کبھی کہتی نہ تھیں الف سے بے
پا یا پہلا سبق الف بے تے

پڑھ کے ابجد وہ ہو گئیں پُر فن
نام اَب جَد کا کر دیا روشن

صاف چلنے لگی زباں فر فر
کر دیا اک جہاں کو زیر و زبر

عزم بالجزم تھا یہی در پیش
شَدّ و مَدّ سے کرے کوئی دِل ریش

پڑھ کے آمادہ تھیں پڑھانے پر
لے گئیں وہ سبق زمانے پر

رباعی

(اکبرالٰہ آبادی مرحوم)

آج وہ ہنستے ہیں میکر جبہ و شلوار پر
ایک دن اُن کو فلک بندھوائے دھوتی تو سہی

اپنی انگولی بہو پر ناز ہے اُن کو بہت
کیمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی

خمسہ (نظیر اکبرآبادی)

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں
یہ بہار عیش یہ شورِ جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب شرابِ ارغوانی پھر کہاں
عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

یہ جو یاں کے گلبدن ملتے ہیں سو سو گھات سے
کچھ مزے کچھ لوٹ حظ ان گلرخوں کی ذات سے
ایک دم ہرگز جدا مت ہو تو ان کے ساتھ سے
جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے
آبِ جنت تو بہت ہوگا یہ پانی پھر کہاں

یہ جو کڑوے ہو کے ہم کو اب جھڑکتے ہیں یہاں
ان کی تلخی میں ہزاروں ہیں بھری شیرینیاں
اٹھ سکے جب تک اٹھا اے دل تو ان کی تلخیاں
لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہونگی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں

رہ وہیں اے دل سدا محبوب رہتے ہیں جہاں
کر لے انکی خدمتیں ہر دم دل و جاں سے میاں
جو تجھے دیویں سو لے لے اور غنیمت اسکو جاں
واں تو ہاں حوروں کے گہنے کے بہت ہونگے نشاں
ان پری زادوں کے چھلوں کی نشانی پھر کہاں

ہو سکے جس طور سن لے دوستوں کی واردات
اور بیاں کر اگلے ان کے ہو جو تجھ پر مشکلات
جس گھڑی آئی قضا کوئی نہ پھر پوچھیگا بات
الفت و مہر و محبت سب ہے جیتے جی کے ساتھ
مہرباں ہی اٹھ گئے یہ مہربانی پھر کہاں

اب جو آغازِ جوانی کی بہاریں ہیں میاں
عیش و عشرت میں اڑا لے زندگی کی خوبیاں
نشہ پیکر کوئی دم کرلے تو سیرِ بوستاں
واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ ماں
دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

ہو کے ہر دم خوبرویوں کی محبت میں اسیر
کھا نگاہ سرمہ سا کی ناوکوں کے دل میں تیر
وصف اب انکا جو کرنا ہے سو کر لے دلپذیر
جا پڑے چپ ہو کے جب شہرِ خموشاں میں نظیر
یہ غزل یہ ریختہ یہ شعر خوانی پھر کہاں

مایوس عاشق کی بد دُعا

یہ دُعا ہے آتشِ عشق میں میری طرح تو بھی جلا کرے
نہ نصیب ہو کبھی بیٹھنا ترے دل میں درد اٹھا کرے
لٹیں ہوں کھُلی اور چشم تر کبھی لب پہ نالۂ سوز گر
ہاں مری تلاش میں در بدر تو پکڑ کے دل کو پھرا کرے
رہے نامراد رقیب بھی نہ خدا دکھائے اُسے خوشی
نہ نصیب شربتِ وصل ہو سدا زہرِ غم وہ پیا کرے
ترے دل میں ہو مری آرزو مری ہی تجھے رہے جستجو !
تجھے چین آئے نہ ایک سُو تو سدا اوداس رہا کرے
تو بھی چوٹ کھائے جب بے وفا آئے دل دکھانے کا پھر مزا
کرے آہ وزاریاں درد سے مجھے بے وفا تو کہا کرے
مری طرح تجھکو خلش رہے مری طرح تجھکو تپش رہے
مرا تو نے جیسے دُکھایا دل ترا دل بھی ویسے دُکھا کرے
تجھے ہر گھڑی ہو مری لگن رہے میری فکروں میں غوطہ زن
تجھے نیند آئے نہ ہجر میں پڑا شب کو تارے گنا کرے
ہاں عدو کا خانہ تباہ رہے سدا اس کا بخت سیاہ رہے
ترا اُس کا یہ نہ نباہ رہے ہو فراق جلد خدا کرے
کہیں آئیں خیر سے پھر وہ دن تجھے چین آئے نہ تاج بن
میں گلے نہ تجھکو لگاؤں پھر مری منّتیں تو کیا کرے !

چشمۂ ہستی

زیرِ گردوں عمر اپنی دن بدن کٹتی گئی !
جس قدر بڑھتے گئے ہم زندگی گھٹتی گئی

عالمِ طفلی کے دن ہیں کس قدر عشرت نواز
ایک دن اِک سال ہے اک سال ہے عمرِ دراز

خانۂ دل سے ہجومِ رنج و غم جبتک ہے دور
خاطرِ آزاد کو ہے جب تلک حاصل سرور

دِن جوانی کے گزرتے ہیں بہ صد آہستگی
سبزۂ ساحل سے رُک رُک کر بہے جیسے ندی

زرد ہو جاتا ہے جب افکار سے چہرہ مگر
پارہ پارہ غم سے ہو جاتے ہیں جب قلب و جگر

تیز ہو جاتی ہے اے گردوں تری رفتار کیوں؟
زندگی اِک پل میں کٹ جاتی ہے آخر کار کیوں؟

ہو گیا وقفِ خزاں جب گلشنِ عیش و نشاط
ہو گئی خاموش جب شمعِ سرور و انبساط

جب قریبِ منزلِ مرگ آگیا رہوارِ عمر
تیز تر پہلے سے کیوں ہو جاتی ہے رفتارِ عمر؟

جائے حیرت ہے ! مگر ایامِ پیری میں بھلا
کون چاہے گا کہ عمرِ بے وفا ہو دیرپا؟

جبکہ احباب اِس جہاں سے چل بسے مُنہ موڑ کر
خوں شدہ دلہائے عالم کو تڑپتا چھوڑ کر

وقتِ پیری چونکہ آ پڑتا ہے سیلِ رنج و غم
جلد تر ہو جاتی ہے تعمیرِ ہستی منہدم

مخزنِ عیش و مسرت ہے مگر عہدِ شباب
اس لئے رہتی ہے گردش آسماں کی محوِ خواب

پریشاں خاطری

چھپی سو سو ہراسانی مری ہر آرزو میں ہے
کہاں وہ کامیابی میں مزا جو جستجو میں ہے

گئے وہ دن کہ اطمینان تھا یاروں کی محفل میں
دلِ مجموعِ مسلم اب پریشاں ہاؤ ہو میں ہے

اگر نادار ہیں تو فاقہ مستی مست رکھتی ہے
اگر زردار ہیں صبح و مسا جام و سبو میں ہے

کتاب پاک میں آیا ہے واعتصمو بحبل اللہ
مگر دیکھو جسے وہ تفرقہ کی آرزو میں ہے

جناب ساقیِ کوثر نے کیا تسکین آیت کو
بھرا رحمت کا شیرہ ساغرِ لاتقنطو میں ہے

دورِ جدید کی حالت

کیوں علم کی ہو خواہش کیا بھوکے ہیں کسی کے
کافی ہے یہ فضیلت بیٹھے ہیں مولوی کے !
حج و زکوٰۃ کیا ہے کیسا نماز و روزہ
ہم جانتے ہیں اُن کو اسباب دِل لگی کے
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ دل میں ہمارے آیا !
مسجد میں گھس گئے تھے اک دن شراب پی کے
سایہ پڑا ہے ہم پر یورپ کی لیڈیوں کا
اب کیا کریں گے یارو ہندوستاں میں جی کے
مسجد کو گھر سمجھ کر کرتے ہیں بت پرستی !
ممبر پہ بیٹھ کر ہم طالب ہیں ممبری کے
آتا نہیں سمجھ میں واعظ کے نیک کوئی !
لے دے کے مدح خواں ہیں حضرت بس اک سخی کے
اک نام رہ گیا ہے اسلام اُٹھ گیا ہے !
پائے ہیں سب کرشمے یہ چودھویں صدی کے
اب اُٹھ گئے جہاں سے سب صاف کہنے والے
لہرا رہے ہیں ہر سُو جھنڈے خوشامدی کے !
پہلی سی نیکیاں سب مفقود ہو گئی ہیں !
پھیلے ہوئے ہیں چرچے ہر چار سُو بدی کے !
ہے "کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ" فرمان گو۔ مُسلم

پھر بھی سمجھ میں لیکن آتا نہیں غنی کے

کس سے بیاں کریں ہم افسوس اپنے دل کی
روتے میں کٹ رہے ہیں اوقات سب خوشی کے
ڈر ہے کہ ہو نہ جاؤ دشمن ہماری جاں کے
انداز سب ہیں ظاہر حضرت کی دوستی کے
بخشش کی ہائے صورت ہے دوسری کیا
ہے صرف یہ سہارا عاشق ہیں ہم نبی کے

خودغرض لیڈر

اے خداوندِ جہاں تیری مدد درکار ہے — تو اگر چاہے تو ہر آفت سے بیڑا پار ہے
لیڈروں کے ظلم نے دم ناک میں ہے کر دیا — ان کی بے پروائی سے چھوٹا بڑا بیزار ہے
قوم کو جب لُوٹ کر آسودہ خاطر ہو چکے — پھر مسلمانوں کی ہمدردی سے ان کو عار ہے
غیر قوموں کی غلامی اُن کے دل کو بھا گئی — نام اردو کا بھی لینے سے انہیں انکار ہے
نام تو حق رکھ لیا لیکن وہ ہے ناحق شناس — ہے دُکان اونچی تو کیا پکوان تو بیکار ہے
وہ جو کہلاتے ہیں سیّد اور آلِ مصطفےٰ — آج اُن کو دین احمد سے فقط انکار ہے
گائے سے ہو دست کش مرغی کی قربانی کرے — کرتا ہے ایسا وہی جو قوم کا مختار ہے
جس پہ تکیہ ہو ہمارا ہم سے وہ نفرت کرے — کشمکش میں مبتلا یارب یہ جسمِ زار ہے
لیڈرانِ قوم کی بدنیتوں سے تو بچا — اُمتِ عاصی تری بے یار و بے غمخوار ہے

رباعی (اکبر الٰہ آبادی مرحوم)

اپنے ہر کام میں انہیں نام سے کام! — کوئی دُکھ میں ہو انہیں آرام سے کام
لیڈر وہ بنے ہیں خود خردشی کے لئے — کچھ قوم سے کام ہے نہ اسلام سے کام

مذہب سے بے اعتنائی

مذہب کا ہو کیونکر علم و عمل دل ہی نہیں بھاتی ایکطرف　　کرکٹ کی کھلائی ایکطرف کالج کی پڑھائی ایکطرف

کیا ذوقِ عبادت ہو اُنکو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں　　حلوائے بہشتی ایکطرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

طاعون و تپ اور کھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے　　بمبے کی روانی ایکطرف اور ساری صفائی ایکطرف

مذہب کا دم تو وہ بھرتے ہیں۔ پر دہ بتوں کو کرتے ہیں　　اسلام کا دعویٰ ایکطرف یہ کافرادائی ایک طرف

ہر سمت تو ہی ایک دامِ بلا رہ سکتے ہیں خوش کسطرح بھلا　　اغیار کی کاوش ایکطرف آپس کی لڑائی ایکطرف

کیا کام چلے کیا رنگ جمے کیا بات بنے کون اسکی سُنے　　ہے اکبر بیکس ایک طرف اور ساری خدائی ایکطرف

فریاد کئے جا اے اکبر کچھ ہو ہی رہے گا آخر کار　　اللہ سے توبہ ایک طرف صاحب کی دہائی ایکطرف

فنا فی القوم کے اوصاف

از جناب شمس العلما پیرزادہ محمد حسین خان بہادر عارف مرحوم۔ رئیس دہلی

نہیں قوم کے درد کی یہ دوا　　نہیں مصلحِ قوم کو یہ روا

کہ ہو کر خفا قوم کی قوم سے　　بھری ناؤ منجھ دھار میں چھوڑ دے

اُسے چاہیئے دل ہو بے مدعا　　کہ ہو قوم کا درد جس میں بھرا

جیئے یا مرے پر رہے قوم میں　　مصیبت بھی ہو گرِ رہے قوم میں

فقط قوم ہی کی ہو دُھن رات دن　　فقط قوم کے گائے گن رات دن

نہ دشمن نہ حاسد کی پرواہ کرے　　نہ ذاتی فوائد کی پرواہ کرے

برا مانے گالی نہ دشنام سے　　فقط کام ہو قوم کے کام سے

نہ ہو جان تک سے بھی اس کو دریغ

نہ مانع ملامت ہو اُس کی نہ تیغ

ساغر چشم

(از جناب مولوی فخر الدین احمد صاحب سفیر کاکوروی)

نیند کا عالم ہے یا کیفِ شراب آنکھوں میں ہے
کیا سرورِ نشۂ عہدِ شباب آنکھوں میں ہے

کہہ رہی ہیں کچھ وہ معنی خیز نظریں صاف صاف
میری ساری آرزوؤں کا جواب آنکھوں میں ہے

چھپ نہیں سکتی کبھی مژگاں کی چلمن سے نگاہ
ترجمانِ رازِ پنہاں یہ حجاب آنکھوں میں ہے

میری آہوں کے اثر سے ہے بہارِ چشمِ نم
دامنِ گل میں ہے شبنم یا گلاب آنکھوں میں ہے

چشمِ نرگس سے زمیں اور آسماں کا فرق ہے
لیکن انجم سے بھی بڑھکر آب و تاب آنکھوں میں ہے

گردشِ شام و سحر نیرنگِ دورِ روزگار
ہر گھڑی اک تازہ رنگِ انقلاب آنکھوں میں ہے

کب تک آخر انتظارِ شہسوارِ مستِ ناز!
اب تو یہ جانِ حزیں پا در رکاب آنکھوں میں ہے

بڑھ گئی سوزِ جگر سے آبروئے چشمِ تر
اشکِ خونیں ہے کہ یہ دُرِّ خوش آب آنکھوں میں ہے

کاش دنیا میں میسر چشمِ بینا ہو سفیر
ورنہ یہ بزمِ تماشا مثلِ خواب آنکھوں میں ہے

کیا قیامت سرمۂ دنبالہ دار آنکھوں میں ہے
کس غضب کی ہیں نگاہیں ذوالفقار آنکھوں میں ہے

شوخیِ چشمِ غزالاں آشکار آنکھوں میں ہے
مستیِ صہبا سے رنگِ لالہ زار آنکھوں میں ہے

لال ڈورے ہیں لہو کے روکشِ رنگِ شفق
عالمِ نیرنگیِ لیل و نہار آنکھوں میں ہے

چشمِ جاناں میں سیاہی بھی سفیدی بھی ہے سرخی بھی
یا سوادِ شام و روم و زنگبار آنکھوں میں ہے

زیبِ چشمِ پاک دامن ہے یہ اندازِ حجاب
مریمِ دوشیزہ گویا شرمسار آنکھوں میں ہے

ہجرِ ساقی میں رواں ہیں اشکِ چشمِ دجلہ ریز
سیرِ دریا یک طرف خود رودبار آنکھوں میں ہے

منتظر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے شوقِ دید میں
دل میں پیدا اضطراب و انتظار آنکھوں میں ہے

یادِ گیسوئے مسلسل میں چلے آتے ہیں اشک
موتیوں کی سی لڑی اشکوں کا تار آنکھوں میں ہے

آج تک نظروں میں پھرتا ہے وہ جلوہ حسن کا
یادگارِ لیلیِ محمل سوار آنکھوں میں ہے!

خوابِ نوشیں میں نظر آیا وہ عالم اے سفیر
صبح کو آئے تو ہیں لیکن خمار آنکھوں میں ہے

فلسفۂ نگاہ

باصرہ وہ پردۂ اعجاز ہے ! قدرتِ خالق کا جس میں راز ہے
روشنیِ شمعِ ایوانِ وجود ! بزم افروزِ شبستانِ وجود !
دستِ قدرت نے جلائے وہ چراغ جنکی طلعت سے ہر اک روشن دماغ
کیا بتاؤں تجھ سے تاثیرِ نظر دل میں ہے پیوست بس تیرِ نظر
اس حسیں کے حُسن کا کیا ہو بیاں سات پردوں میں کیا جس کو نہاں
یوں نکلتا ہے کماں سے چھوٹ کے جیسے گرتا ہے ستارہ ٹوٹ کے
ہے کمندِ جذبِ دل تارِ نگاہ ! سچ یہ ہے ہوتی ہے دل سے دل کو راہ
دیکھنا محبوب کا ہے اس کو عید ہر نگہ ہے محشرستانِ اُمید
اس کی وسعت کا بھلا ہو کیا بیاں سات پردے اسکے ہیں سات آسماں
چاند بھی سورج بھی سیارے بھی ہیں اس فضا میں سیکڑوں تارے بھی ہیں
سب حسینانِ جہاں رشکِ قمر رات دن ہیں جلوہ آرائے نظر
وسعت اتنی اور کس پردے میں ہے ابرِ بارندہ بھی اس پردے میں ہے
اس کے ہر قطرہ میں ہے دریا کا جوش اس کا ہر آنسو ہے اک طوفاں خروش
چھپتے ہیں بارش میں جیسے مہر و ماہ یوں ہی زائل ہوتا ہے نورِ نگاہ
ابرِ غم میں چھپ گیا نورِ نگاہ ! دونوں آنکھیں پیرِ کنعاں کی گواہ
مثلِ یوسف چاہ میں ہے یہ نہاں یہ نہیں تو آنکھ ہے اندھا کنواں
یہ نہیں تو کیا زمین و آسماں ہے اندھیری رات کا سا اک سماں
ہے یہ تحقیقِ جدید اے بے خبر آسماں ہے پردۂ حدِّ نظر
یہ نہیں تو خاک ہے دنیا کی سیر زندہ درگور آدمی اس کے بغیر

ہے چراغِ خانۂ ہستی یہی ! زینتِ میخانۂ مستی یہی !
ہے یہی مہرِ منیرِ مردمک جلوہ آرائے سریرِ مردمک
تختِ شاہی پر ہے یہ جلوہ طراز سایہ افگن چترِ مژگانِ دراز
کون ایسا ترکِ تیر انداز ہے چشم جسکی خوابگاہِ ناز ہے
مخبرِ اغراضِ انسانی ہے یہ ترجمانِ شوقِ پنہانی ہے یہ
مظہرِ آثارِ صولت ہے یہی ! ماہرِ فنِ شجاعت ہے یہی !
رعب سے لرزاں دلِ سفاک ہے چار کونوں میں اسی کی دھاک ہے
سرخوشِ حلم و مروت ہے یہی نشہ میں بدمست نخوت ہے یہی
خازنِ گنجینۂ عفت ہے یہی جوہرِ آئینۂ عصمت ہے یہی
جام پیمائے شرابِ شرم و ناز ساغرِ خم خانۂ راز و نیاز !
منکشف اس پر سب اسرارِ خفی عالمِ علمِ قیافہ ہے یہی !
ہر نگہ ہے شارحِ مافی الضمیر ! وارداتِ دل کی تفسیرِ کبیر
درس آموزِ کتابِ دلدہی سلسلہ جنبانِ رسمِ عاشقی
اس کی مجبوری سے دل ہے بے ہراس اس کی مایوسی سے اِک دنیائے یاس
برقِ ہستی سوز اس کی اک ادا اِک اشارہ اس کا پیکانِ قضا
سیرتِ انساں بتاتی ہے نگاہ ! خصلتِ انساں بتاتی ہے نگاہ
ہے یہی اے بے خبر معیارِ نفس دے رہی ہے ہر نگہ اظہارِ نفس
فتنہ برانگیز بہرِ عاشقاں ! دشنۂ خوں ریز بہرِ عاشقاں
تلخ ہے کیا کوزۂ زہرِ نگاہ ! ہے غضب زہرابۂ قہرِ نگاہ
ہے جواہر کی لڑی تارِ نظر بھر دیئے یہ کس نے موتی کوٹ کر
ہے یہی میٹھی چھری دل کے لئے اک نمکدان زخمِ بسمل کے لئے

نطق اس میں اس طرح مستور ہے
جس کے آگے یہ زباں معذور ہے

اس کے ہر ایما پہ دل مجبور ہے!
جو نگہ نے کہہ دیا منظور ہے

وہ کشش وہ طاقت آنکھوں نے دی
کیا حقیقت جذبِ مقناطیس کی

حرف مرئیات پر اس کا اثر!
دل کو باہر کھینچ لاتی ہے نظر

قہر ہیں آفت ہیں وہ بے باکیاں
اُف نگاہِ ناز کی سفّاکیاں!

تو نے کیا دیکھا نہیں سحرِ نگاہ
اُف کرشمے اس کے خالق کی پناہ

ہے یہ وہ چلتا ہوا جادو عزیزؔ
دل پہ کچھ رہتا نہیں قابو عزیزؔ

لوری

(حرماں نصیب مسلمان بچہ کی برگشتہ دل ماں کہہ رہی ہے)

مرے خوش خرام سو جا مرے خوش کلام سو جا
تجھے روتے روتے بیٹا ہوئی شب تمام سو جا

تجھے ہاتھ جوڑتی ہوں تجھے سو سلام سو جا
مرے مہ جبین سو جا مرے لالہ فام سو جا

تری آہ و زاریوں میں ہوئی شب تمام سو جا

تجھے درد کونسا ہے تجھے اضطراب کیا ہے
تو ادھر ہی لیٹتا ہے نہ اُدھر ہی لیٹتا ہے

مری جان تیرے صدقے تجھے آج کیا ہوا ہے
مری لوریوں پہ شاید کہیں ہو نہ ہو خفا ہے

تجھے رنج ہے کہ ہر شب ہے وہی کلام سو جا

نئی لوریاں بھلا اب یہ بتا کہاں سے لاؤں
مرے بس میں ہو تو بیٹا تجھے عرش پر چڑھاؤں

کوئی رتبہ رہ نہ جائے ترے واری صدقے جاؤں
کبھی مارشل پکاروں کبھی چانسلر بناؤں

ترے ایسے ایسے رکھوں میں ہزار نام سو جا

ایک پتنگ

(از جناب اختر اجمیری)

ایک جھاڑی میں کہیں الجھا ہوا تھا اک پتنگ — وہ زبانِ حال سے یوں کہہ رہا تھا برملا
دیدۂ حیرت سے دیکھیں سب مرا حال تباہ — گوشِ عبرت سے سنیں میرا پُر از غم ماجرا
ایک شائق نے خریدا تھا مجھے بازار سے — ڈور مجھ میں باندھ کر اور چھوڑ کر سوئے ہوا
ٹھمکیاں آہستہ سے دیں اور کبھی دی شے مجھے — ڈھیل دے دیکر سہارا جھونک دی کھینچا ذرا
پھر تو میں اڑنے لگا تن کے مثل شاہباز — پھر تو مجھ میں بھر گئی بس کبر و نخوت کی ہوا
آسماں والوں میں گویا ہو گیا میں بھی شریک — بات کرتا تھا ہوا سے اس قدر اونچا چڑھا
پہنچتا مجھ تک نظر بازوں کا کیا پیکِ نظر — ہو گیا تھا میں تو رفعت میں ستارہ چرخ کا
شادماں تھے اہلِ دنیا دیکھکر میری اڑان — رشک کرتی تھی میری پرواز پر بادِ صبا
مجھ کو چیونٹی کے برابر خلق آتی تھی نظر — اور میں چشمِ حقارت سے اُسے دیکھا کیا
دل میں رہ رہ کر یہی کہتا رہا افسوس سے — کر دیا پابند مجھ کو کس لئے تو نے خدا
میں اگر آزاد ہوتا ڈور کے پھندے سے آج — سیرِ عالم کو دکھاتا اپنے اُڑنے کی ذرا
دور ہو جاتا نگاہ خلق سے مثل خیال — آسماں کے پار ہوتا صورتِ فکر رسا
بس یہ کہتے کہتے کھچکر ڈور ٹوٹی دفعتاً — اور طمانچوں سے ہوا نے مجھ کو بیدم کر دیا
پھر بھلا کب پاؤں جم سکتے تھے میرے اوج پر — ڈگمگاتا۔ لڑکھڑاتا۔ جھونک کھاتا جا بجا
آپڑا شامت سے اس جھاڑی میں ہو کر سرنگوں — میرا سارا تن بدن کانٹوں میں پھنس کر چھد گیا
ایسا الجھا ہوں کہ اب یاں سے نکلنا ہی محال — کوئی دم کا میہماں ہوں، پیش ہے راہِ فنا
اپنی حد سے پاؤں پھیلائے زیادہ میں نے جب — کبر و نخوت کی بدولت دیکھنا نیچا پڑا

یوں ہی سب کی ڈور ہے اختر خدا کے ہاتھ میں
حکم بن پتہ بھی ہل جائے ذرا مقدور کیا

گھوڑوں کی مجلس

اِک روز کسی گھوڑے کے دل میں یہ سمائی
انسان مری قوم سے کرتا ہے بُرائی

رکھا ہے مرے بھائیوں کو اس نے جکڑ کر
تدبیر ہو ایسی کہ ملے اِن کو رہائی

میں قوم کی ذلت نہ کبھی دیکھ سکوں گا
اِک آگ سی ہے اس نے مرے جی کو لگائی

یہ ٹھان کے جنگل کے رفیقوں کو بلایا!
سب آئے کہ اس بات میں تھی سب کی بھلائی

حاضر ہوئے بوڑھے بھی بچھیرے بھی جواں بھی
دیتے ہوئے انسان کی سختی کی دُھائی

پہلے تو ہری گھاس سے کی ان کی تواضع!
مہمانوں کو پھر بات جو تھی دل کی بتائی

اِک گھوڑے کو کرسی پہ صدارت کی بٹھا کر
سب نے یہ کہا آپ کریں راہ نمائی

ہونے لگا گھوڑوں کا بڑی دھوم سے جلسہ
دینے لگی اس قوم کی اِک شان دکھائی

کچھ دیر تو ہوتی رہیں آپس میں صلاحیں!
ہر ایک نے تدبیر رہائی کی بتائی

مجلس سے اُٹھا آخرِ کار ایک بچھیرا
اور اٹھ کے متانت سے زباں اپنی ہلائی

تقریر پہ سو جان سے صدقہ تھی فصاحت
تھی گھوڑے کی باتوں میں قیامت کی صفائی

بولا کہ مری قوم میں غیرت نہیں باقی!
کس طرح ہو پھر غیر کے ہاتھوں سے رہائی

جینا جو ہمارا ہے وہ ذلت کا ہے جینا
ہم نے تو بزرگوں کی بھی عزت ہے گنوائی

ہم گاڑیاں انسان کی کھینچیں یہ غضب ہے
محنت کریں ہم اور یہ کھا جائے کمائی

سردی سے رہیں ہم تو طویلوں میں ٹھٹھرتے
لیٹے یہ حویلی میں لئے گرم رضائی!

گھوڑ دوڑ میں ہم اپنا بہاتے ہیں پسینہ
جو اس کی بھلائی ہے وہ ہے اپنی بُرائی

کیا کہئے مصیبت ہمیں پڑ جاتی ہے کیسی
ہو جائے جو ظالم کے قبیلوں میں لڑائی

لوہے کی لگامیں ہیں تو ہیں چمڑے کے چابک
افسوس کہ غیرت نہ مری قوم کو آئی

روئے کوئی اس قوم کے دکھڑے کو کہاں تک
ہم سمجھے ہیں اے وائے غلامی میں بڑائی

اے قوم یہ اچھا نہیں ہر روز کا جلنا — زیبا ہے ہمیں قید سے انساں کے نکلنا

تقریر ہوئی ختم تو بیٹھا وہ بچھیرا — ہر گھوڑے نے مجلس میں دلیلوں کو سراہا

ہر بات بچھیرے کی سراہی گئی لیکن — کچھ کہنے پہ آمادہ تھا اک اور بھی گھوڑا

لاغر تھا بہت گرچہ بڑھاپے کی وجہ سے — اٹھا کہ اسے قوم کو تھا راہ پہ لانا

بولا کہ مرے دوست کی باتیں ہیں بہت خوب — پر جوشِ جوانی نے کیا ہے اسے اندھا

مانا کہ اسے قوم کی ذلت نہیں بھاتی — بچہ ہے ابھی اس نے زمانہ نہیں دیکھا

ہے زور دیا آپ نے انساں کے ستم پر — تقریر کو ہے خوب مثالوں سے سجایا

سختی سے ہمیں پیش وہ آتا ہے یہ مانا — سختی میں جو راحت ہو تو سختی ہے گوارا

انسان کے احسان کو سمجھا نہیں تم نے — دیتا ہے طویلوں میں تمہیں وقت پہ دانا

رہنے کو طویلوں میں سمجھتے ہو برا تم! — جنگل کی رہائش میں ہے سو طرح کا کھٹکا

دن رات وہاں گھات میں رہتے ہیں درندے — پینے کا جو پانی ہے وہ اکثر نہیں ملتا

ہے قید میں انسان کی راحت ہی سراسر — ہر حال میں ہے اس کی غلامی ہمیں زیبا

دن آتے ہیں ایسے بھی کہ بارش کی کمی سے — ہو گھاس نہ پیدا تو یہ رکھتا ہے ذخیرا

یہ آپ پہنتا ہے جو کمخواب کے کپڑے — زربفت کی جھولوں سے بھی ہے ہمکو سجاتا

بیمار جو ہو جاؤ تو کرتا ہے دوا بھی! — کرتا ہے ہمارے لئے نقصان گوارا

گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی جو ہوتی ہے تواضع — آرام وہ حیواں کو میسر نہیں ہوتا

آرام ہیں لاکھوں ہمیں انساں کے دم سے — میرا تو شکایت پہ کبھی لب نہ کھلے گا

میں نے تو بتا دی ہے تمہیں سب کے بھلے کی — مانے جو نہ کوئی تو مجھے کچھ نہیں پروا

ان باتوں سے حیراں سے کچھ رہ گئے گھوڑے — تقریر وہ کی اس نے کہ جادو تھی سراپا

سب مان گئے دور شکایت ہوئی سب کی

تھی گھوڑے کی تقریر میں تاثیر غضب کی

طریقہ تمدن

(از جناب حضرت ظہیر دہلوی)

اک روز ایک دوست نے مجھ سے کیا سوال
ہاں کچھ بیان حالِ جہانِ خراب ہو
آسودہ روزگار میں کیوں کر رہے بشر
کیا صورتِ معاشرتِ شیخ و شاب ہو
میں نے کہا کہ ہیں یہ تمدن کے دو طریق
اس میں سے جو پسندِ طبیعت جناب ہو

(۱) عیش کا طریقہ

دنیا کی بود و باش کا گر پوچھتے ہو حال
ہے زندگی کا حظ جو زر بے حساب ہو
بے صرفہ صرف حضرتِ دینار چاہیئے!
کچھ جمع خرچ ہو نہ حساب و کتاب ہو
سامان سب بہم ہوں نشاط و سرور کے
جوشِ نشاطِ طبع ہو عہدِ شباب ہو
یارانِ ہم جلیس ہوں خوش باش خوش معاش
یک دل ہوں سب دوئی کا نہ باہم حساب ہو
آبِ رواں ہو باغ ہو ابرِ بہار ہو!
ساقی ہو دورِ جام ہو شربِ شراب ہو
دن رات چہچہے ہوں شب و روز قہقہے
مستِ شراب کوئی کوئی مست خواب ہو
رقاصہ مہر چہرہ ہو سرگرم رقصِ ناز!
دل کش صدائے بربط و چنگ و رباب ہو
جلوت تو یہ ہے اور جو خلوت کو پوچھئے
تنہائی کا مکاں ہو جُدا جائے خواب ہو
بالائے بام فرش ہو اور فرش پر پلنگ
تکیئے ہوں نرم بستر گل فرش خواب ہو
بیگانہ و یگانہ نہ ہو کوئی مخل
طُرّہ ہو اُس پہ یہ کہ شب ماہتاب ہو
آغوش میں ہو جلوہ گر اک چودھویں کا چاند
اُٹھتی جوانی اور شروعِ شباب ہو
ہر دم گلے میں ہاتھ ہوں چسپاں ہوں لب سے لب
لطفِ کنار و بوس و عتاب و خطاب ہو
بیصرفہ بے نقط وہ کہے منہ سے لام کاف
اُس مست برق وش کو نہ شرم حجاب ہو
جبتک بسر ہو عیش سے یوں ہی گزاریئے
جبتک کہ نوجوانی و عہدِ شباب ہو

(۲) طریقِ زہد

گر یہ نہیں تو قطع تعلق کرو قبول
ہاں کوئی روز زہد کی مٹی خراب ہو

مسجد میں چل کے بیٹھئے نعرہ لگایئے
دو نانِ خشک گندم دیک کوزہ آب ہو

تسبیح ہاتھ میں ہو مصلّےٰ ہو دوش پر
وعظ و نماز و روزہ و درسِ کتاب ہو

حضرت کو اپنے بوریئے بدھنے سے ہو غرض
کاموں سے اک جہان کے پھر اجتناب ہو

رندوں سے طنز و طعن ہو مستوں سے ہشت مُشت
ہر وقت ذکر و فکر عذاب و ثواب ہو

داڑھی اِدھر بڑھے تو اُدھر سر منڈایئے
اس جزر و مد کی بحث میں دونا ثواب ہو

ہو شہر و اہلِ شہر میں مشہور نام پاک
قاضی شہر و شیخ مشیخت مآب ہو

یہ بھی نہ ہو تو زندگیٔ تلخ ہیچ ہے!
بدتر بہیم سے ہے کوئی شیخ شاب ہو

(۳) دونوں میں اوسط روی کا طریقہ

آسودگی کی پوچھو تو وہ شکل اور ہے
آزاد ہو نہ فکرِ عذاب و ثواب ہو!

دیوانہ باش و مسلکِ توحید پیش گیر
بدمست ہو نہ شیخِ تقدس مآب ہو

تکلیف ہو کہ عیش ہو ہر حال میں ہو شکر
دوزخ کا غم نہ فکرِ حساب و کتاب ہو

دشمن سے دشمنی ہو نہ اپنوں سے دوستی
اس پر نہ التفات نہ اُس پر عتاب ہو

غمگیں نہ رنج میں ہو نہ شادی میں شادماں
دنیا کے کل امور سے پھر اجتناب ہو

اوسط روی ہے خوب جو توفیق دے خدا
مفتیٔ شہر اور نہ رندِ خراب ہو

راہِ رضا و صبر و قناعت کر اختیار
اور انتظارِ وقت بشکلِ حباب ہو

میخواروں کی عید

وہ اٹھی گھٹا جھوم کے میخانہ پہ چھائی
پھر مستوں کو فکرِ مے گلرنگ سمائی!
پھر دُخترِ رز دیکھو دلہن بن کے وہ آئی
بس شیخ جی تم نے تو یونہیں عمر گنوائی

ساون میں دیا لومۂ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

پھر برسوں میں خالق نے ہمیں دن یہ دکھایا
پھر بادہ گلرنگ نے رنگ اپنا جمایا
بیخود کیا اس کو اُسے مخمور بنایا!
اب سوجھتا ہے کس کو یہاں اپنا پرایا

ساون میں دیا لومۂ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

ساقی ہے مۓ ناب ہے احباب ہیں ہمدم
میخانہ میں سب عیش کے ساماں ہیں فراہم
پھر فیض سے یہ پیرِ مغاں کے ہوا عالم
مدہوشی میں پھر رند گلے ملتے ہیں باہم

ساون میں دیا لومۂ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

پھر موسمِ گل آیا گئی فصلِ خزاں کی!
پھر تختۂ گلستاں کلہے تصویر جناں کی
اے حضرتِ واعظ بھلا اب توبہ کہاں کی
مر مر کے گزاری ہے یہ مدت رمضاں کی

ساون میں دیا لومۂ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

اظہارِ مسرت کیا ہر فرد بشر نے
پوشاک نئی بدلی ہے ہر ایک شجر نے
رنگ اور نکالا ہے کچھ اِن برگ و ثمر نے
بلبل سے بصد ناز کہا یہ گلِ تر نے!

ساون میں دیا لومۂ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

پھر آنے لگیں باغ میں کویل کی صدائیں　　پھر اُمڈی چلی آتی ہیں گھنگور گھٹائیں
یہ دیکھ سماں رند نہ کیوں عیش منائیں　　کس طرح نہ لیں ساقی مہوش کی بلائیں

ساون میں دیا لو مٹہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

جب ساقیٔ گلفام نے بال اپنے سنوارے　　کرنے لگے کچھ ابروئے خمدار اشارے
عرق آگیا چہرہ پہ مگر شرم کے مارے　　بے چین ہوئے وحشی یہ عشاق پکارے

ساون میں دیا لو مٹہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

رباعیات عید

عید کا دن آج ہے خرم ہیں سارے مومنیں　　کہتے ہیں آپس میں مل کے عابدین الفائزین
ہے دعا حق سے مسلمانوں کو عیدِ فطر یہ　　ہو مبارک از طفیل رحمت اللعالمیں

عیدِ غربت

صبحِ محشر شامِ غربت میں کہیں پنہاں نہ ہو　　عید کا مژدہ ندیم حسرت وارماں نہ ہو
جانتا ہوں ہر ادا تیری ہے در پردہ بلا　　اے فلک تیرا مہِ نو خنجرِ بُرّاں نہ ہو

بے دوست کی عید

چاند اپنا جب نہ دیکھا کیا ہلالِ عید ہے　　عید گر آئی تو کیا جب عید کا ساماں نہ ہو
جامہ ہائے خوش سے مجھکو تن کی عریانی ہی خوش　　جس سے اے دستِ جنوں زد میں کسی داماں نہ ہو

اہل اتحاد کی عید

ہو مبارک دوستوں کو شادیٔ ایامِ عید　　اتفاق باہمی ہے جانفزا انعامِ عید
قابلِ توقیر ہے نامی رسمِ اتحاد!　　اے خدا سب کے لئے مسعود ہو پیغامِ عید

الوداع یارانِ شباب الوداع

(از جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی)

اے سرِ پُر غرور! رخصت ہو / دونوں آنکھوں کے نور رخصت ہو
غیر سجدہ جبیں و پیشانی / تم بھی رخصت کہ ہے گراں جانی
چشم و ابرو تمہیں بھی اپنا سلام / آخری گھونٹ ہے اُٹھا لو جام
ناک نقشے کی اب ضرورت کیا؟ / دفترِ زندگی تمام ہوا
لب و دنداں زباں و کام و دہاں / خوب لوٹے مزے جہاں کے ہاں
تم بھی رخصت کہ وقت آخر ہے / دم کوئی دم کا ہی مسافر ہے
ترش و شیریں و تلخ کیا کیا کچھ! / تم نے چھوڑی کہیں بھی دنیا کچھ
رات دن وقف کار تھے رخصت / تم بھی مطلب کے یار تھے رخصت
زندگی کا تھا بس تم ہی پہ مدار / الوداع دوستان دانش کار
جیتے جی ہر طرح کا سانسا تھا / ایک آتا تھا ایک جاتا تھا
سکّے گویائی کے یہ پڑتے تھے / بات کرتا تھا پھول جھڑتے تھے
سب یہ خواب و خیال ہے اب تو / زندگانی وبال ہے اب تو!
اب نہیں طاقت کمالِ مقال / طوقِ گردن ہے شامتِ اعمال
شکم و سینہ بد قرینہ ہیں! / گوشت خواری کا اک دفینہ ہیں
کون اب یہ بلا لگائے پھرے / گندگی کا گھڑا اُٹھائے پھرے
دست و بازو کبھی تھے طاقتور / توڑ ڈالے ہیں جن سے کاسۂ سر
ان کو جنبش بھی اب نہیں جڑتی / مُنہ کی مکھی تلک نہیں اُڑتی!
غش کی نوبت سی رہتی ہے طاری / پاؤں چلنے سے ہو گئے عاری!

جن کو میلوں نہیں تھی دشواری
دو قدم چلنا اب اُنہیں بھاری

ہائے افسوس طرفہ حال ہے اب
دل کو رہ رہ کے یہ ملال ہے اب

اس تنِ نازنیں کو دم پر دم!
کس تکلف سے آہ رکھتے تھے ہم

خوشبوؤں سے اسے بساتے تھے
عطر مل مل کے ہم نہاتے تھے

داغ دھبّے سے جی بُرا ہوتا
گرد اُڑتی تو دم فنا ہوتا

اب خدا جانے حال کیا ہوگا؟
عاقبت کیا۔ مآل کیا ہوگا؟

دی ندا کانشنس نے احمق
ہے بقا کے لئے فنا مطلق!

صبح ہوگی اسے نہ پھر کوئی شام
کیڑے کھا جائیں گے یہ ہے انجام

آخر فنا۔ آخر فنا (از جناب نواب امین الدولہ مہر لکھنوی)

طورِ دلِ خراب بنا پر بگڑ گیا
گو شیشۂ حباب بنا پر بگڑ گیا

ہر چند مثل خانۂ دنیائے بے ثبات
ہیں خانماں خراب بنا پر بگڑ گیا

اک دن وہ آئیگا کہ کہیں گے فلک کو سب
خیمہ تو بے طناب بنا پر بگڑ گیا

کام اپنا بدسلوکیٔ گردوں سے بار بار
بے دخلِ انقلاب بنا پر بگڑ گیا

وہ بے ثبات ہوں کہ پسِ مرگ مقبرہ
ہر چند لاجواب بنا پر بگڑ گیا

ایوانِ عیشِ اہلِ فنا کو نہ پوچھئے
مانند بزمِ خواب بنا پر بگڑ گیا

چلتا نہیں ہے ابلق ایام ایک چال
کتنا یہ بدرکاب۔ بنا پر بگڑ گیا

رباعی (اکبر الہ آبادی مرحوم)

خوانِ الوانِ فلک پر کیا مسرت ہو مجھے
گور کا لقمہ ہوا، جو اس کا مہماں ہوگیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ دراز
سینہ اک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہوگیا

خمسہ بر غزل غالب
(از جناب نفیس)

کوئی بات اپنی کہہ کے مفت رسوائے جہاں کیوں ہو عدو ضبطِ محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو
کسی پہلو سے لوگوں پر عیاں رازِ نہاں کیوں ہو کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نہ ہو جب تو ہی تو در سے ترے مجھکو تعلق کیا نہ کہنا اب کبھی مجھ سے یہیں سر پھوڑ کر مر جا
جہاں میں پتھروں کا قحط یا اینٹوں کا ہے توڑا وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

کہیں وہ بات کیوں سنکر جسے وہ اپنا منہ موڑیں ہنسیں دشمن پھپھولے اپنے دل کے مدعی پھوڑیں
گریں کیوں پاؤں پر کیوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑیں وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کشیدہ دل سے ہو کس واسطے اس کی خطا کیا ہے اثر اپنی کشش کا اس نے تنگ آکر دکھایا ہے
قصور اسکا ہی جس نے آپ کو خود دور کھینچا ہے غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

سوا میرے اگر پیدا کروگے کوئی شیدائی کہیگا کوئی بازاری تمہیں اور کوئی ہرجائی
یہ کیا سوجھی تمہیں بیٹھے بٹھائے دل میں کیا آئی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

ستم پر تم ستم کرتے ہو ہم ناچار سہتے ہیں نہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں
مگر اس فکر میں ڈوبے ہوئے ہر وقت رہتے ہیں یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نشیمن باغ میں ہوتے ہیں ہر اک شاخ پر ہمدم کہیں طوطی کہیں قمری پہ کی ہوگی نظر ہمدم

جو کہنا ہو وہ کہہ چک اور نہ مجھکو دیکھ کر ہمدم
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کیئے نالے کچھ ایسے غیر پا کر میری حالت کو
کہ اس کمبخت نے شرمادیا شورِ قیامت کو
غمِ پنہاں سے میرے کر دیا آگاہ خلقت کو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

تمہارا لطف جس ناشاد کی حالت پہ پیہم ہے
نشانہ وہ بلاؤں کا ہے اور اک تودۂ غم ہے
عبث فکر آسماں کو فتنہ انگیزی کی ہر دم ہے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نفیس آسا جو چاہے دل کی نکلے آرزو غالب
نہ کرنا پھر فریب آمیز ایسی گفتگو غالب
کہیں چالوں سو بھی اپنے ہوئے ہیں خوبرو غالب
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سو تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

آزادگی

کیوں خشتِ خاک پر کوئی دل داغدار ہو
مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو
ہو کر جو ذرہ ذرہ عناصر میں جائے مِل
یکساں ہے گردِ راہ بنے یا غبار ہو
آواز کی طرح جو جہاں سے نکل گیا
پتھر کی طرح سینے پہ پھر کیوں غبار ہو
اللہ رے خودی کہ رہے جب تک اپنا نام
کوئی تو غم زدوں میں بھی اپنے شمار ہو
انساں کو بے ثباتی پہ بھی اپنی ناز ہے!
نقشِ قدم کی طرح یہ کیوں خاکسار ہو
گھوڑے اڑائے کیوں نہ وہ سرپٹ غرور کے
مر کر بھی جس کی روح ہوا پر سوار ہو
اے ہستی سختیاں تری کب تک سہے بشر
میں پیٹ دوں تجھے جو مرا اختیار ہو
کیوں غم کا ڈر خوشی سے ہمائیوں لگاؤ تم
ہاں یہ بھی نذرِ عالمِ ناپائیدار ہو

خمسہ بر غزل جناب غالب مرحوم (از جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم سہارنپوری)

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا
خوگرِ کلفت کو وہ آرام پہونچائیں گے کیا
جوشش وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا
دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

اس طرح ٹالو گے قصہ سُن سُنا کر کب تلک
یہ جفاکاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک
ہو گی آخر حاجتِ عرض مکرر کب تلک
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

دوست کیوں پند و نصیحت پر تُلے ہیں خواہ مخواہ
مجھکو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ
حضرتِ ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

قتل گہ سے روز ناکامیاب آتا ہوں میں
وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھئے تو راہ پر کیوں کر انہیں لاتا ہوں میں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

چارہ سازوں نے جو زنجیر و سے باندھا یوں سہی
ہے یہی ہیجان وحشت کا مداوا یوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی
گر کیا ناصح نے مجھکو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

ہتھکڑی اور طوقِ گردن گیر سے بھاگینگے کیوں
خوگرِ ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں
اس مناسب چارۂ تدبیر سے بھاگیں گے کیوں
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہِ عشرت اسد
ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرت اسد
پیش ہے بااینہمہ مرزا کو یہ دقت اسد
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہے کھائینگے کیا

فریاد و شکوۂ دوراں

کر رحم غریبی پہ مری گردشِ ایام | بدعہدیِ دوراں نکر اتنا مجھے بدنام
برگشتگیِ بخت نہ رکھ اتنا تو ناکام | اے شومیِ طالع نکر اتنا مجھے بدنام
بیمہریِ جاناں تو مرے ساتھ وفا کر | اے نالۂ شبگیر مرے حق میں دعا کر
اے رنج تو ہی دل کی مسرت کا سبب ہو | حرماں تو ہی دافعِ اقسام تعب ہو
او سوزشِ دل واسطۂ دوری تپ ہو | او روئے سیہ جلد کہیں وصل کی شب ہو
اے گردِ رہِ یار تو آنکھوں کو ضیا دے | طوفاں مری کشتی کو کنارہ سے لگا دے
اے دستِ جنوں میرے گریباں سے خبردار | اے خارِ مغیلاں مرے داماں سے خبردار
رنجیدگیِ یار عنایت کی یہ جا ہے | کر عفو گناہوں کو مرا حال برا ہے

قطعہ

(از جناب منظور)

کیا خوشی کے مثل بلبل روز و شب تھے چہچہے | جن دنوں آغوش میں وہ غیرتِ گلزار تھا
گرم رہتا تھا سدا ہنگامۂ عیش و طرب | شمعِ بزمِ عیش اس کا شعلۂ رخسار تھا
پیار کی باتیں تھیں ہر دم اور الفت کی نگاہ | میری دلجوئی کا خواہاں وہ شکر گفتار تھا
دورِ گردوں سے تھا اکین دور میں تھا جامِ مے | نُقلِ مے وہ بوسۂ لب ہائے شکر بار تھا
تفرقہ پرداز گردوں رشک کھاتا تھا مدام | وصلِ شوخِ مہ جبیں تھا طالعِ بیدار تھا
رات بھر منظور اب روتا ہوں کہہ کہہ کر یہی | ہائے وہ دن کیا ہوئے جو میں تھا اور دلدار تھا

رباعی

(سر اقبال)

ہر محکمہ میں عہدے تقسیم ہوں برابر | ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری
خفیہ پولیس میں جب اک حد ہوئی ہے قائم | ہندو ہیں ہیڈ افسر مسلم ہیں آنریری

بزمِ ناز (از جناب فرخی)

ایک بزمِ ناز میں شب کو ہوا میرا گزر / بزم کیا تھی حُسن کا گویا عجائب خانہ تھا
بادۂ ناب و شبِ مہتاب کا وہ جوش تھا / طور تھا یا نور تھا یا حور کا کاشانہ تھا
تھی بساطِ عیش یا تختہ چمن کا تھا کھلا / سنبل و گل جبیں زلف و عارض جانانہ تھا
لعل لب کے پے بہ پے لیتا تھا بوسے جامِ مے / رند ہر اک محوِ دیدِ نرگسِ مستانہ تھا
موئے مشکیں جوشِ مستی کو چھپا سکتے نہ تھے / خندۂ دنداں شمعِ زلفِ دوتا کاشانہ تھا
عکس افگن پھول میں وہ پھول سے رخسار تھے / بلبلِ تصویر گویا بلبلِ دیوانہ تھا
لحنِ داؤدی کا اُن نغموں میں ایسا لطف تھا / دیس تھا یا پوربی جو راگ تھا شاہانہ تھا
راگ تھا ہر رنگ میں ہر رنگ اک نیرنگ تھا / جو وہاں تھا اس قدر وارفتہ تھا گویا نہ تھا
مِلکے رعبِ حسن و فرطِ شوق دونوں ایک تھے / ساز تھا بے پردگی کا ساز کا پردا نہ تھا
بادۂ بیرنگئ الفت سے سب مخمور تھے / اٹھ گیا تھا پردہ اور رنگِ دوئی بیگانہ تھا
بار پا سکتے نہ تھے خوفِ عدو رشکِ رقیب / گرچہ دروازہ پہ ظاہر میں کوئی پہرا نہ تھا
شمع رو ساقی پہ غش تھے بادہ کش چاروں طرف / اسکو کچھ پروا نہ تھی اور سینکڑوں پروانہ تھا
ہوتے ہی ساقی سے میں دوچار ششدر رہ گیا / یہ مُرقع میری آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا
مجھکو محوِ لذتِ دیدار اپنا دیکھکر ! ! / مسکرا کر دے دیا جو ہاتھ میں پیمانہ تھا
ہاتھ کیا تھا شاخِ گل پر پنجۂ خورشید تھا / گُل کھلا تھا سرو پر وہ عارض و بالا نہ تھا
میری قسمت جاگ اٹھی اس دولتِ بیدار سے / سحر کا وہ ہاتھ تھا مانا یدِ بیضا نہ تھا
لیتے ہی پیمانہ وہ پیمانِ الفت بندھ گیا / جس کا کچھ وہم و گماں حاشا نہ تھا حاشا تھا
ڈھونڈنا وہ دل کو میرا وہ ادا سے پوچھنا / لائے بھی تھے ساتھ دل؟ پہلو میں بھی یا نہ تھا
آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں راز کی سب ہو گئیں / کیا نیازِ عشق تھا کیا نازِ معشوقانہ تھا

بادۂ دیدار سے میں اس قدر سرشار تھا
سر پہ فرقت کی گھڑی ہی اسکا کچھ کھٹکا نہ تھا
بانگ دی مرغِ سحر نے شمع پھیکی پڑ گئی !
تار تھا نظروں میں عالم نور کا تڑکا نہ تھا
صورِ اسرافیل تھی اس دم موذن کی اذاں
آفتابِ حشر تھا وہ صبح کا تارا نہ تھا
ہائے میں کس سے کہوں کیسا سماں تھا فرخی
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

مذمتِ دنیا

یہ گُل بوٹے گلستاں کے ہیں سب جھوٹے چمن جھوٹا
بہارِ جانفزا جھوٹی خیالِ باغ و بن جھوٹا
پھنسے ہرگز نہ اس دنیا کی الفت میں کوئی نادان
یگانوں کا ہی بیگانہ سایاں چال و چلن جھوٹا
جو سمجھا اپنی ہستی کو تو آصف ہم نے یہ سمجھا
مکاں جھوٹا۔ نشاں جھوٹا یہ فانی جسم و تن جھوٹا
یہ گُل بوٹے گلستاں کے ہیں سب جھوٹے چمن جھوٹا

اتفاق - استقلال

اس دور میں سمٹ جائینگے پر زندہ رہیگا وہ باقی
جو قائم اپنی راہ پر ہی جو پورا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کیسی بلندی سے ان تو مونکو دے پٹکا ہے
اک وقت وہ تھا جب رہتے تھے سب ملکر باہم ایک سے ایک
اب بحث میں اردو ہندی ہی یا قربانی یا جھٹکا ہے

بند

تھا میں غمِ فراق میں بے ہوش و بے خبر
دہشت تھی نے ضرر کی نہ تھی نفع پر نظر
لیکن ہوا ثبوت کہ اُس کا ہے یہ اثر
ناصح نے قسمیں دی تھیں مجھے ہاتھ جوڑ کر
اک تار ثابت اس لئے میرے کفن میں ہے

خمسہ بر غزل جناب غالب مرحوم

تھیں کبھی زلفیں جو زیبِ سنبلستاں ہوگئیں خارِ بنکر جلوہ گردِ دل و زِ مژگاں ہوگئیں
شکل نرگس چشمہائے شوخ و فتاں ہوگئیں سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو کہ پنہاں ہوگئیں

آہ اے عہدِ جوانی وہ امنگیں اب کہاں تو ہی جب رخصت ہوا پھر کیا ہے عمر جاوداں
ولولے ہی ولولے تھے جب تلک تھے ہم جواں یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

ہوگیا ہر چند پہلو سے جدا لختِ جگر دیکھتی آنکھوں ہوا گم یک بیک نورِ نظر
دیدۂ بے نور وا تھے شوق سے آٹھوں پہر قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سینکڑوں قربانیٔ رشکِ رقابت ہوگئے ہیں زبانِ خلق پر دن رات جنکے تذکرے
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہوگئیں

ہمکو یہ سمجھے ہوئے ہیں اسقدر بے ننگ و نام ننگ ہے ان کے لئے ہم ہوں اگر ان کے غلام
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

دلمیں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بار بار آن واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار
تیر بنکر آرہی ہیں جا رہی ہیں برق وار وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

دیدیا ہے اذن دربار نے تو کھا کر پیچ و تاب کم ہوا منت سماجت سے مگر اس کا عتاب

ہوگیا ہے سہل گو محفل میں ہونا باریاب — واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

کام اچھا دیگیا صبر و سکوں انجام کار — ورنہ پہونچی تھی یہ نوبت پیرہن ہوتا رتار
دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار — بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

میکدے میں تشنہ لب جو رندِ ناکام آگیا — چشمۂ آبِ بقا تک وہ مے آشام آگیا
جی گیا جو کشتۂ شمشیرِ الام آگیا ! — جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم — نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین اور علوم
ہیچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہو ان سب کی دھوم — ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو تڑپاتا ہے رنج — غمزدوں کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج
ضبط و استقلال سے آخر تنگ آتا ہے رنج — رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

دوستو رونے کا میرے کیوں اڑاتے ہو مذاق — یہ لہو رونا بھی ہے آنکھوں کا حسنِ اتفاق
ہے شبِ ہجراں کی تاریکی زیادہ دل کو شاق — جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

بزم میں جو ہم نشیں تیرا ہے راتیں اُس کی ہیں — صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں
اس سے بھی وہ خوش نصیب اعلےٰ ہے راتیں اسکی ہیں — نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

لگ رہی تھی دلکو جوشِ درد میں نالوں کی لے — چھوڑتے کیا ہاتھ باقی پیرہن میں کوئی شے

کر دیا صد شکر ضبطِ غم نے اس قصہ کو طے
بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز رونا الاماں
اسکی آنکھوں نے تو باندھا ابرِ باراں کا سماں
کر دیئے اس نے بھی مرزا کی طرح دریا رواں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

قطعہ

(مرزا مہدی علی خاں قبول لکھنوی)

وعدہ آنے کا کیا تھا اور تم آئے نہ تھے
آہ میرے مُنہ پہ کہتی تھی اثر میں نے کیا
نالہ غل کرتا تھا حل میں نے کیا مطلب ترا
کرتی تھی ہر پل اشارہ چشمِ تر میں نے کیا
جذبِ دل کہتا تھا کھینچا ہے اسے میں نے اِدھر
عشق کہتا تھا یہ کارِ سخت تر میں نے کیا
اور کلیجے کی پھڑک کہتی تھی جو حق ہو وہ سُن
کر دیا بے تاب اور راہی ادھر میں نے کیا
کہتی تھی سینہ کی آگ اس بت کا دل کر کر کے نرم
مہرباں مدت میں تیرے حال پر میں نے کیا
الغرض شرمندۂ احسان یہ سب کرتے رہے
انتظارِ آمد آمد تا سحر میں نے کیا
تم نہ آئے رات بھر کیا زور تھا تم پر مگر
شرمساران سب کو اے رشکِ قمر میں نے کیا

اقبال

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا
قیدیٔ زندانِ غم کا نالۂ شبگیر کیا
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں
زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا
آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھولے کھلے مرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

محبت کیا ہے؟

بے قراری ہے کہیں، یہ کہیں بے تابی ہے
دلِ مضطر میں تڑپ آنکھوں میں بیخوابی ہے
کبھی پٹی کبھی نشتر ہے رگِ جاں کیلئے
کبھی بخیہ ہے ہر اک چاکِ گریباں کے لئے

چشمِ امید کبھی ہے نگہِ یاس کبھی!
مرہم ریش کبھی سودۂ الماس کبھی

زخم اِس تیغ کا بسمل کو مزا دیتا ہے
مرحبا کی دہنِ زخم صدا دیتا ہے
یہی زخمی ہے جو قاتل کو دعا دیتا ہے
زیرِ شمشیر سرِ عجز جھکا دیتا ہے

یہی لب تشنہ ہیں مشتاق جو کوثر کے نہیں
گھونٹ شربت کے ہیں اگر گڑے دمِ خنجر کے نہیں

عاشق کا دعوے!

ہم سے پوچھو کہ ہیں ہم مے کشِ میخانۂ عشق
اپنی مٹی میں ہے شاملِ گُلِ پیمانۂ عشق
سینکڑوں یاد ہیں گزرے ہوئے افسانۂ عشق
دیکھے ہیں بوقلموں جلوۂ مستانۂ عشق

سارے حالاتِ جہاں پیشِ نظر رکھتے ہیں
جامِ جم دل ہے زمانہ کی خبر رکھتے ہیں

سینۂ چاک جو دکھلائیں کبھی گل کی طرح!
نالے کرنے لگیں گل باغ میں بلبل کی طرح
حال اپنا جو پریشان ہو سنبل کی طرح
خوبرو آئیں ابھی پیچ میں کاکل کی طرح

ڈون کی ہم جو یہ لیتے ہیں بجا لیتے ہیں!
چار باتوں میں فرشتوں کو لگا لیتے ہیں!

زن و شوہر کے تعلقات

جب تک کہ دم ہے ایک کا دمساز ایک ہو
فریاد ہو کہ راگ پر انداز ایک ہو
یہ زندگی ستار ہے یہ دونوں اس کے ساز
گو ہوں الگ الگ مگر آواز ایک ہو

بیوی

غم سے مرجھائے ہوئے دل کے لئے ابر بہار
ہر مصیبت میں سپر ہر حال میں جی سے نثار
سر کا تاج آنکھوں کی ٹھنڈک بصف نیکی نصف پیار
گھر کی آقا اور لونڈی کی طرح خدمت گذار

ایکساں اور بے غرض کرتا وفا کوئی نہیں
دوست سچا نیک بیوی کے سوا کوئی نہیں

بیوی کا خطاب شوہر سے

وہیں تک دم ہی جبتک ساتھ دم کے میرا پیارا ہو
میں اک گرتی ہوئی دیوار تم اسکا سہارا ہو
تمہیں ہو گے فقط دل میں، یہ دل جبتک ہے سینے میں
کُھرچ سکتا ہی کون اب کھد گیا جو اِس نگینے میں

شوہر کا جواب

یہی ہے جو مری تسکیں بھی ہی اور راحت بھی
یہی ہے جس سے جینے میں مزا بھی ہی حلاوت بھی
نظر ساغر ہے آنکھوں سے شراب حُسن پیتا ہوں
خداوندا نہ اُترے یہ نشہ جبتک کہ جیتا ہوں

عورت

اس کے جیسا کوئی نیک اور اس کے جیسا بد نہیں
اسکی نفرت اور محبت دونوں کی کچھ حد نہیں
گر نہ مانے تو بلا ہے آدمی کی جان کو
ماننے پر آئے تو سجدہ کرے شیطان کو

رباعیاتِ قحط

(از جناب طالبؔ)

سوکھا وہ پڑا کہ سبز گلشن نہ رہا — تر زاہدِ خشک کا بھی دامن نہ رہا
گھی تیل کا ذکر کیا اب تو طالب — چہرے پہ کسی کے رنگ و روغن نہ رہا

افلاس کے غم میں جب گرانی مل جائے — پھر خاک میں کیوں نہ زندگانی مل جائے
دھوئیں انساں ہاتھ جان سے طالب — تلوار کے گھاٹ کا جو پانی مل جائے

دانے کی جو اس طرح گرانی ہو جائے — کیونکر نہ حیات خصم جانی ہو جائے
پیش آئی ہے وہ بھوک کی سختی کہ اگر — پتھر کا کلیجہ ہو تو پانی ہو جائے

کیونکر نہ غم و فاقہ براتی ہو جائیں — کیونکر نہ اسیرِ غم دیہاتی ہو جائیں
غنچہ دہنوں کے پاؤڈر روٹی سے گال — ہیہات کہ سوکھ کر چپاتی ہو جائیں

خشکی سے کسی کا چہرہ ظاہر نہ ہوا — جز دانۂ اشک کبھی باہر نہ ہوا
ہے خشک لہو بدن کا ایسا کہ کبھی — پھنسی کا بھی ایک دانہ ظاہر نہ ہوا

صد حیف کہ زہر بھی نہ کھانے کو ملے — ڈھائی چاول بھی کب پکانے کو ملے
سر آنکھوں سے دوڑے آئے طالب — ناکوں سے جو چنے چبانے کو ملے

ختم شد

اعجوبۂ اسرار

از

(خان بہادر) نقی محمد خان خورجوی (سابق سپرنٹنڈنٹ پولیس)

یہ مختصر مگر دلکش اور خوش وضع کتاب اخلاق اور حیاتِ روحانی کی نشو و نما کے لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کے زرین اصول کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کو نہایت دل آویز پیرایہ میں آجاگر کیا ہے۔ پہلی سانس سے آخری سانس تک کے ہر مرحلہ اور نشیب و فراز کو ایسے مؤثر انداز میں ظاہر کیا ہے کہ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ غرضیکہ کتاب بحیثیت مضامین، زبان اور خیالات، ترتیب و تہذیب نہایت قابلِ قدر اور لائق داد ہے۔ اس کا اقتباس طالبِ علموں کی نظر سے گذرنا مفید ہوگا۔ یہی تالیفات ہیں جو دنیا کے روگیوں اور گم کردگانِ راہ ہدایت کو اصلی اور حقیقی منزلِ مقصود کا راستہ بتلاتی ہیں۔ حکامِ سررشتۂ تعلیم کے لئے اسکول کی لائبریریوں کے واسطے اس کا منظور فرمانا ایک صحیح علمی خدمت ہے۔

(رسالہ تعلیم و تربیت، لاہور

فروری سنہ ۱۹۱۸ء)

پیش لفظ (اقتباس)

"...... مجھے ابتدا میں تصوف سے
صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ مجالسِ حال وقال
میں شریک ہوتا تھا لیکن اس کے صحیح مفہوم سے
واقف نہ تھا۔ اکثر یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ شریعت
کے جامع اور مکمل قانون کے باوجود طریقت
میں کیا خصوصیت ہے جسکی عوام کو ضرورت
محسوس ہوتی ہے۔ اکثر اہل الرائے سے اس بارے
میں گفتگو ہوئی لیکن میں مطمئن نہ ہوا۔ لیکن
قدرت کو تو کچھ اور منظور تھا اور اس کی فیض
بخشی کے بھی عجیب عجیب اسباب ہوتے ہیں۔
...... میری بیوی مرض دق میں مبتلا تھیں
اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ مرض لاعلاج سمجھا جاتا تھا۔
...... ایک روز شب میں وہ وقت آپہنچا
جب سانسوں کا شمار ہی باقی رہ گیا۔ عجیب
خاموشی اور افسردگی کا عالم تھا۔ میری بیوی
نے پُرحسرت نگاہوں سے اپنی معصوم بچّی
کی طرف دیکھ کر کہا کہ "اب تیرا خدا نگہبان
ہے"۔ اس کے بعد غفلت طاری ہوگئی۔
...... ادھر یہ دنیاوی آلام اور دماغی

خلفشار اُدھر قدرت کی نعمت ہائے غیر مترقبہ
کی فراوانی۔ میں اپنے پلنگ پر جاکر لیٹا ہی تھا
کہ آنکھ لگ گئی۔ اب میں ایک دوسرے ہی
عالم میں تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک
قدسی صفت بزرگ خوش الحانی سے حالتِ
وجد میں ایک فارسی کا شعر پڑھتے ہوئے خوشنما
سنگِ مرمر کی مسجد سے برآمد ہوئے۔ مفہوم شعر
سے وہ خود بھی متاثر تھے اور مجھ پر بھی محویت
کا عالم طاری تھا...... وہ میرے قریب
تشریف لائے اور فرمایا مَنْ عَرَفَ
نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ کے معنی اور
مطالب پر غور کیا کرو تو تمہاری ساری الجھنیں
دُور ہو جائیں گی۔ بس اسی میں سب کچھ ہے
جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے اپنے رب
کو پہچانا۔ اس ارشاد کے بعد میری آنکھ کھل
گئی۔ اسکو خواب کہوں یا غفلت یا ہوشیاری
لیکن اس نے میری خوابیدہ روحانی قوتوں
کو ہمیشہ کے واسطے بیدار کر دیا۔ کیا قدرت
کاملہ بخیل ہے؟ کیا مالک اپنے بندوں

کو انوارِ الہٰی کی برکتوں سے محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا گنہگار مستحق ہدایت نہیں ہیں؟ ضرور ہیں کیونکہ اس کے الطاف تو عام ہیں، اس کی رہنمائی اور ہدایت قدم قدم پر ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ جویائے حُسنِ لیلیٰ کو طلبِ صادق ہو۔ چنانچہ ارشادِ عالی کے بعد میں نے بزرگوں کی صحبت اختیار کی۔ کتابیں دیکھیں اور حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رح اور حضرت شاہ ابوالخیر صاحب دہلوی سے بیعت حاصل کرنے کے بعد عملاً بھی جو کچھ بن پڑا کیا۔ یہ کہنا تو میرے لئے دشوار ہے کہ اس کوشش میں میں نے کیا حاصل کیا..... اس کتاب سے جو کچھ فوائد پڑھنے والوں کو حاصل ہوں وہ ان کی خوش نصیبی ہے..... شریعت اور طریقت دراصل دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی شرابِ وحدت ہی جو عشق کی بھٹی میں کھنچکر دو آتشہ اور سہ آتشہ ہو جاتی ہے

اس کتاب کے دو ایڈیشن بہت عرصہ ہوا شائع ہو چکے تھے۔ اب احباب کے اصرار پر یہ

تیسرا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے

قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ علم مجلسی

۵۔ ستنام ہاؤس

گرانٹ روڈ ——— کراچی-۱

شعروں کی ڈکشنری

اس کتاب میں عاشقانہ، ظریفانہ، ناصحانہ، دینی و دنیوی غرض ہر قسم کے چار سو مضامین ہیں۔ ہر عنوان کے تحت چوٹی کے شعراء کے پندرہ یا بیس نہایت ہی باموقع، پُرمعنی اور کھٹکے دار اشعار ہیں جو خط و کتابت میں، تحریر و تقریر میں، لیکچر اور وعظ میں روزانہ معمولی گفتگو میں بڑی خوبی سے استعمال ہو سکتے ہیں اور تحریر و تقریر کو پُرلطف، دلچسپ، موثر، مدلل و دلنشین بنا دیتے ہیں۔ کتاب کا نام علمِ مجلسی ہے اور یہ پہلے چار حصّوں پر مشتمل ہے۔

قطعات و رُباعیات۔ علمِ مجلسی کے پانچویں اور ساتویں حصّے میں بڑے بڑے شاعروں کی دلچسپ رُباعیات اور قطعات ہیں۔ ان میں حقیقت و معرفت، عبرت و نصیحت اخلاق و ظرافت کے مضمون پہلو بہ پہلو سجے ہوئے ہیں۔

غزلیات۔ یہ علمِ مجلسی کا چھٹا حصّہ ہے۔ یہ اور آٹھواں حصّہ عام فہم، دلچسپ اور چُبھتے ہوئے اشعار کی غزلیات کا نادر مجموعہ ہیں۔ چھٹے حصّہ میں بہادر شاہ ظفر کے ایامِ اسیری کا انتہائی پُرسوز اور دردناک کلام بھی شامل ہے۔ اب تک ہر حصّے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پاکستان میں پہلی بار۔

مکمل سٹ آٹھ حصّوں میں۔ قیمت، ہر حصّہ دو روپے ۵۰ پیسے

ادارہ علمِ مجلسی
۵۔ ستنام ہاؤس
گرانٹ روڈ۔ کراچی ۱